ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

تذکرہ وتبصرہ

بعض تحریکی مسائل کے ضمن میں امیر تنظیم اسلامی کی ایک اہم تحریر

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

A STATEMENT OF

CONCRETE FACTS

HIGHLIGHTS IN PRECASTING

- Pioneered the development of precast prestressed concrete industry in Pakistan.
- Covered more than 100,00,000 sq. feet area by our precasts throughout Pakistan.
- More than 12 different kinds of roofing systems available Latest development is Double Tee Planks upto 60 long and hollow-core slabs upto 30' long.

HIGHLIGHTS IN CONSTRUCTION

The group started activities in 1960, constructed 8-Sugar Mills, 5-Dozen Textile Mills, 2-Jute Mills, 1-Cement Factory, 2-Paper Mills, 5-Beverage Plants, Silos for Seed Processing Plants, Chemical Plants, Prill Towers for Fertilizers Factories 50,00,000 sft of shall type structure for numerous industries as hundreds of other industrial buildings and Terminal-III at Karachi Airport.

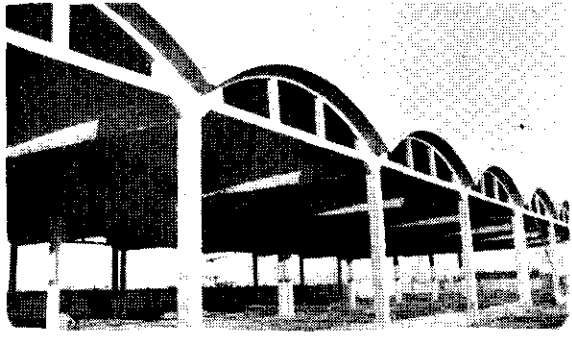

IZHAR GROUP OF COMPANIES

Leaders of innovative construction and precasting technology
H. O Izhar Houe 3 Rivaz Garden, P. O. Box 763, Lahore
Tel: 320108, 320109, 321748, 55629 Telex: 44974 IZHAR PK

Sales Offices Throughout Pakistan

Muridke (Lahore) Phone: 700510
Karachi Phone: 312080
Jauharabad Phone: 588, 590,
Peshawar Phone: 78254
Rawalpindi Phone: 64765
Multan Phone: 34073, 73469
Faisalabad Phone: 51341, 51343

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد	۳۷
شمارہ	۲
جمادی الاخریٰ	۱۴۰۸ھ
فروری	۱۹۸۸ء
فی شمارہ	-/۵
سالانہ زرِ تعاون	-/۵۰

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مینجنگ ایڈیٹر

اقتدار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات — ۲۵ سعودی ریال یا -/۱۱۵ روپے پاکستانی

ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا — ۶ امریکی ڈالر یا -/۱۰۰ روپے پاکستانی

یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ — ۹ امریکی ڈالر یا -/۱۵۰ " "

شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ — ۱۲ امریکی ڈالر یا -/۲۰۰ " "

ترسیلِ زر: ماہنامہ میثاق لاہور، یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ (پاکستان)، لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ فون: ۸۵۲۶۸۳، ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلیشرز: لطف الرحمٰن خان مقامِ اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور

مشمولات

- عرضِ احوال ——— ۵
  اقتدار احمد
- تذکرہ و تبصرہ ——— ۱۱
  مولانا آزاد اور مولانا مودودی
  ڈاکٹر اسرار احمد
- خطابِ جمعہ ——— ۳۵
  اقبال کی عظمت
  آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے
  ڈاکٹر اسرار احمد
- مولانا حمید الدین فراہیؒ اور حدِّ رجم ——— ۶۹
  ڈاکٹر اسرار احمد
- شیخ الہندؒ اور انتخابِ امام الہند ——— ۷۳
  "جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی" پر ایک تنقیدی نوٹ از مولانا محبوب الرحمٰن
  تبصرہ از مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی
- سات ہفتے وطن سے باہر ——— ۸۵
  امیر تنظیم اسلامی کے حالیہ بیرونِ ملک سفر کی روداد
  مرتب : قمر سعید قریشی
- رفتارِ کار ——— ۹۷
  مرتب : مختار حسین فاروقی

ان شاء اللہ العزیز و بفضلہٖ تعالیٰ وبعونہٖ

تنظیمِ اسلامی

کا

تیرھواں سالانہ اجتماع

جمعۃ المبارک یکم اپریل ۸۸ء تا سوموار ۴ اپریل ۸۸ء

طارق آباد۔ ضلع بہاول نگر

میں منعقد ہو گا

یہ مقام چشتیاں اور بہاولنگر کے درمیان برلب سڑک واقع ہے اور سمہ سٹہ سے بہاولنگر جانے والی برانچ ریلوے لائن پر بھی مدرسہ نامی ریلوے سٹیشن سے متصل ہے!

●●●●●●

میثاق کے شماروں کو محفوظ رکھنے کی ایک عمدہ شکل!

میثاق کے سال بھر کے شمارے محفوظ رکھنے کے لیے ادارے نے ایک خوبصورت مضبوط اور پائیدار گتے کا کور بنوایا ہے جو صرف دو روپیہ کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن۔ ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

اظہارِ تشکر

گزشتہ شمارے میں ہم نے قارئین سے میثاق کے بارے میں اُن کی رائے ایک سوالنامہ کی صورت میں طلب کی تھی۔ الحمدللہ قارئین نے ہمارے اس اقدام کو پسند کیا اور کثیر تعداد میں اپنی آرا۔ اور مشورے ہمیں ارسال کیے۔ ہم اُن تمام حضرات کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔ ان تجاویز اور مشوروں کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ جو تفصیلی تجزیے کے بعد اپنی سفارشات مرتب کرے گی۔

اور اگر مناسب سمجھا گیا تو اسے آئندہ کسی قریبی اشاعت میں شائع بھی کر دیا جائے گا۔

(ادارہ)

●●●●●●

خصوصی رعایتی پیشکش

ماہنامہ 'میثاق' کی

۸۷ء کی مکمل فائل

جنوری تا دسمبر ۱۲ شمارے

مضبوط دیدہ زیب جلد میں ہدیہ -/۵۰ روپے

گتے کے مضبوط کور میں ہدیہ -/۴۰ روپے

نوٹ: مذکورہ قیمت میں ڈاک خرچ شامل نہیں۔

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن، فون: ۸۵۲۶۸۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

ملک خداداد پاکستان جسے عہد حاضر کی ایک مثالی اسلامی ریاست کا نمونہ بننا تھا' اس میں چالیس سال سے زیادہ طویل عرصہ گزر جانے کے بعد اب تک اس سمت کیا پیش رفت ہوئی؟ یہ جائزہ حوصلہ افزاء نہیں' ہمت کو پست کر دینے والا ہے تاہم حقائق کا سامنا کیے ہی بنے گی اور یہ بھی تو ہے کہ جن لوگوں میں بھی اللہ تعالیٰ مایوس ہو کر بیٹھ رہنے کی بجائے کچھ کر گزرنے کا داعیہ پیدا فرمائے انہیں مستقبل کے لئے رہنمائی ماضی کے تجربات ہی سے ملے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کو ایک اسلامی ریاست کے قالب میں ڈھالنے کا جو تھوڑا بہت کام ہوا' وہ اس کے قیام کے بعد اولین پانچ سات سال میں ہی ہو پایا تھا۔ بعد میں مثبت کام کم اور منفی زیادہ ہوا اور قریب کے دس سالوں میں تو سارے کیے کرائے پر پانی پھیرنے کا عمل جاری رہا ہے۔ نفاذ اسلام کی آڑ میں ایسی طولانی بحث و تکرار کا دروازہ کھول دیا گیا جو حقیقی ارادے کی عدم موجودگی کے باعث محض وقت کا ضیاع ثابت ہوا اور فضاء میں بے یقینی اور انتشار فکری کا دھواں چھوڑ گیا۔

پاکستان کے عالم وجود میں آنے کے فوراً بعد واحد قومی جماعت مسلم لیگ تو اندرونی شکست وریخت کا شکار ہو گئی۔ ملک گیر دینی جماعتوں پر بھی سکتہ سا طاری تھا۔ علماء کا بڑا اور فعال حصہ چونکہ عملاً قیام پاکستان کا مخالف رہا تھا چنانچہ انہوں نے لاتعلقی کا طرز عمل اختیار کر لیا۔ ان کا ایک طائفہ جو تھانوی گروپ پر مشتمل تھا اور جس کی ہمدردیاں تحریک پاکستان کے ساتھ وابستہ رہیں' اپنی افتاد طبع کے اعتبار سے ہی سیاست سے دور رہتے ہوئے مسند تعلیم وارشاد کی رونق برقرار رکھنے کی روش پر قائم رہا۔ زور شور کی سیاست کی عادی ایک اور دینی جماعت..... مجلس احرار اسلام..... جو پاکستان کی مخالفت میں کسی سے پیچھے نہ رہی تھی' باقاعدہ اعلان کے ساتھ سیاست سے دست بردار ہو گئی۔ لے دے کے ایک جماعت اسلامی بچی جو اپنی تنظیم اور

تربیت کے زور پر کارکنوں کی ایک کھیپ میدان میں لا سکتی تھی۔ اس جماعت نے زندگی کا ثبوت دیا اور ایک نظریاتی ریاست کے منصّہ شہود میں آجانے پر اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے کچھ کر گزرنے کی ٹھانی۔ جماعت اسلامی نے عوام کے دینی جذبات کو تحریک دے کر مطالبہ دستور اسلامی کی مہم اس زور سے چلائی کہ ملک کے درودیوار اس کی صدائے بازگشت سے گونج اٹھے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسے بزرگوں کی آرزو کو بھی زبان مل گئی جو مجلس دستور ساز کے نقار خانے میں گویا طوطی کی آواز تھے۔ جماعت اسلامی کا یہ احسان ماننا ملک کے ہر دین پسند شہری پر واجب ہے کہ اس کی کوشش سے ہمارے روشن خیال دستور سازوں کو ایک ایسی رجعت پسندانہ "حرکت" کرنی پڑی جس پر بہت سے سر شرم سے جھک گئے تھے۔ یہ حرکت قرارداد مقاصد کی شکل میں ہماری ریاست کا مشرف بہ اسلام ہونا تھی اور پاکستان میں اسلامی ریاست کے قیام کی طرف اولین پیش رفت بھی۔

پھر دستور سازی کے جاں گسل مرحلوں کا آغاز ہوا۔ یہ اونٹ کسی کروٹ بیٹھتا ہی نہ تھا۔ سیاسی مسائل ہی کم گھمبیر نہ تھے کہ اس پر مستزاد نفاذ اسلام کی کڑوی گولی کا نگلنا جو خواہی نہ خواہی قرارداد مقاصد پاس کرنے کے بعد گویا لازم ہو گیا تھا..... خوئے بدرا بہانہ بسیار..... عذر پیش کیا گیا کہ یہاں نافذ کون سا اسلام ہو گا؟۔ بہتّر (۷۲) فرقوں کو اسلام کی کس تعبیر پر جمع کیا جائے؟؟۔ ملک کے سنجیدہ و فہمیدہ طبقات کے سامنے یہ سوالات واقعی ناقابل عبور گھاٹیوں کی شکل اختیار کرنے لگے تھے کہ علماء دین نے ایک یادگار کارنامہ انجام دیا۔ جملہ مکاتب فکر کے اکتیس (۳۱) مسلّمہ اور مستند اکابر علماء بمقام کراچی جمع ہوئے۔ ان میں اہل سنت کے تمام معلوم و مشہور مسالک (جنہیں فرقوں کا نام دے کر ستم ڈھایا جاتا ہے) کی نمائندگی ہی نہ تھی، شیعہ علماء اور مجتہد بھی بطیب خاطر شامل ہوئے۔ اور بائیس (۲۲) نکات پر مشتمل ایک یادداشت مرتب کی جن میں اسلامی دستور کے اساسی اصولوں پر اتفاق کر کے معترضین کا منہ بند کر دیا گیا۔ یہ ملک میں اسلامی ریاست کے قیام کی جانب دوسری مثبت پیش رفت تھی۔

افسوس کہ قابل ذکر مثبت پیش رفت کا باب یہاں آکر ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد جو ہے وہ رجعت قہقہری کے سوا کچھ نہیں۔ اس کا رونا رونے پر آئیں تو بات لمبی ہو جائے گی۔ ہم نے دو مثبت باتوں کا ذکر کیا تو دو ہی منفی عوامل بھی بیان کریں گے۔ یہ دو ہی قیامت ڈھا

گئے' انہی میں شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمائش ہو جائے گی۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اولین مثبت پیش رفت کا سہرا جماعت اسلامی کے سر ہے' اب یہ کہے بغیر بھی چارہ نہیں کہ اس پیش رفت پر پہلا شب خون بھی اسی جماعت نے مارا۔ انقلاب قیادت کا نعرہ لگا کر جونہی جماعت اسلامی انتخابی میدان میں اتری' ارباب اقتدار کے لئے اس کے مطالبہ دستور اسلامی کے معنی بدل گئے۔ ہم اس معاملے میں جماعت کے خلوص و اخلاص پر کسی شبہے کا اظہار نہیں کرتے' اس نے پوری دیانت داری سے یہ سمجھا ہو گا کہ ایک اسلامی ریاست کو چلانے کی اہلیت موجودہ میسر قیادت سے زیادہ وہ خود رکھتی ہے لیکن اس کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کی مسلم لیگی قیادت جس میں دین سے رشتہ اخلاص رکھنے والے بھی شامل تھے' جماعت کی حریف اور مدمقابل بن گئی۔ جماعت اسلامی جس کٹھن گرج اور توقعات کی بلند پروازی کے ساتھ اس میدان میں اتری اس کا بھرم تو ۱۹۵۱ء میں پنجاب کے پہلے صوبائی الیکشن (جو ملک کا کسی بھی سطح پر پہلا عام انتخاب تھا) میں ہی کھل گیا لیکن نظریاتی ریاست کے قیام کا خواب ضرور پریشان ہوا۔ اسلام کی مرغی دو ملاؤں میں حرام ہو کر رہ گئی۔ ہم اقدام کی اس عجلت کو نتیجہ کے اعتبار سے جماعت کی ہمالیائی غلطی گردانتے ہیں۔ وہ اپنی حکمت عملی کو اپنی اولین مثبت پیش رفت ہی کے تابع رکھ کر عوام و خواص میں دین کی طرف رجوع کی خواہش کو قوی سے قوی تر کرتی چلی جاتی تو اسے ہر طبقے سے حمایت حاصل ہوتی' حلیف ملتے' حریف نہیں۔ اسلامی دستور کے اساسی اصولوں پر علماء کا اتفاق بھی ایک بیش قیمت اثاثہ تھا جس سے امت کے اس حصے میں اتحاد و یکجہتی کے عمل کو آگے بڑھایا جا سکتا تھا لیکن انتخابی سیاست نے اس عمل کو بھی معکوس سمت میں ڈال دیا۔ آج ہمیں فرقہ واریت کی جو عفریت اپنے چاروں طرف پھنکارتی نظر آتی ہے اس میں سب سے بڑا دخل اسلام کو انتخابی سیاست کا محور بنانے کا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک سے زیادہ جماعتیں اسلام کے نام پر ووٹ مانگنے نکلیں گی تو انہیں یہ واضح کرنا ہو گا کہ ان کے اسلام اور دوسروں کے اسلام میں کیا فرق ہے۔

ہمارے نزدیک پاکستان میں اسلامی ریاست کے قیام کی جانب پیش رفت کی راہ میں دوسرا بڑا منفی عامل دینی جماعتوں کا بحالی جمہوریت جیسی تحریکوں میں اتحاد و اشتراک بنا ہے۔ اہل سیاست نے جب یہ محسوس کیا کہ اقتدار کی کلید عوام کے ہاتھ میں نہیں' کچھ مخفی طاقتوں کی جیب

میں ہے تو انہوں نے محض جمہوریت کی بحالی کو تمام مسائل کا واحد حل جانا اور ہماری مختصر تاریخ میں متعدد مواقع پر اس مقصد کے لئے کثیر الجماعتی اتحاد وجود میں آئے 'متحدہ محاذ بنے اور ہمیشہ ہی ایسا بھی ہوا کہ مذہب کے عنصر کو بھی بامر مجبوری ہی سہی 'اس میں شامل ضرور کیا گیا' دینی جماعتوں کو ہاتھوں ہاتھ لینے میں مصلحت تھی کہ لوگ دین کے نام پر ہی کسی تحریک کے لئے قربانی پیش کرتے ہیں۔ لیکن نتیجہ ہر مرتبہ یہ رہا کہ اس ساری محنت اور جدوجہد کا ثمر کوئی اور اڑا لے گیا۔ اسلام کے لئے دی گئی قربانیاں رائیگاں گئیں اور اسلام کی اپیل پہلے سے کم ہو گئی۔ اضافی طور پر دو نقصانات ان تحریکوں میں دینی جماعتوں کی شمولیت کے یہ بھی ہوئے کہ اولاً ہماری ترجیحات میں تقدیم و تاخیر کا معیار متاثر ہوا۔ اسلام کو اپنی اولین ترجیح رکھ کر دینی جماعتیں بحالی جمہوریت اور معاشی انصاف جیسی تحریکوں کو صرف تائید دے کر بھی ان کی تقویت کا سامان کر سکتی تھیں تاہم یوں ان کی منزل کھوٹی نہ ہوتی۔ وہ جمہوریت اور معاشی انصاف کی بات بھی صرف اسلام کے حوالے سے کرتیں تو آج نفع نقصان کا میزانیہ مختلف ہوتا۔ ثانیاً متذکرہ جزوی اور ہنگامی تحریکوں میں دین داروں کو ان سیاسی عناصر سے اتحاد و اشتراک کرنا پڑا جن کا اپنا قبلہ راست نہ تھا۔ دین سے لاتعلق عناصر بلکہ ایسے ایسے سیاست دان علماء کے ہم نشین ہوئے جن کے ملحدانہ خیالات کسی سے ڈھکے چھپے نہ تھے۔ یوں دینی جماعتوں نے اپنی شناخت کو ہی مشکوک نہ بنایا بلکہ اپنی ہی صفوں میں سے چنیدہ لوگوں کو اس بات کا جواز بھی فراہم کر دیا کہ وہ خاص فریق انہیں اگر پسند نہیں تو فریق مخالف کی رفاقت اختیار کر لیں۔ اس کی مثالوں سے ہماری سیاسی تاریخ بھری پڑی ہے تاہم ماضی قریب میں جو ہوا وہ اپنی مثال آپ ہی ہے۔ دینی جماعتوں نے مارشل لاء کے خلاف اور بحالی جمہوریت کے حق میں ہر نوع کے سیاسی عناصر کا ساتھ دیا تو انہی میں سے قابل لحاظ تعداد میں اکابرین و زعماء نے مارشل لاء کی گود میں جا بیٹھنا پسند کیا جس میں اختیار و اقتدار کا سرچشمہ ایک ایسا شخص تھا جس کا زہد و تقویٰ انہیں باقی سب باتوں پر بھاری لگا۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک کی دینی جماعتیں آج بدترین داخلی انتشار کا شکار ہیں۔ ان کے حصے بخرے ہو گئے۔ ایک ایک دینی جماعت کم از کم دو ٹکڑوں میں تو بٹ ہی گئی ہے 'تقسیم در تقسیم کا عمل جاری رہے تو کچھ عجب نہیں۔ "اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا" ..... جماعت اسلامی بظاہر اس تقسیم سے بچ گئی لیکن چرکے

اسے بھی لگے۔ جماعت کا مضبوط نظم آڑے آیا ورنہ وہ داخلی صورت حال ابھی فراموش نہیں کی جاسکی ہوگی جس میں سے اختلاف وافتراق کی خبریں چھن چھن کر باہر آتی رہی ہیں۔

ان حالات میں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ملک کے دینی حلقے گروہی تعصبات سے اپنے ذہن کو آزاد کر کے ٹھنڈے دل سے پاکستان میں اسلامی ریاست کے قیام میں اپنے کردار کا جائزہ لیں۔ گزشتہ تجربات کی روشنی میں اس جانب مثبت پیش رفت کے لئے ایک واضح اور متعین لائحہ عمل تشکیل دیں۔ ہمارے تجزیئے میں اگر انہیں صداقت اور خلوص کی جھلک نظر آتی ہو اور اس کے بنیادی نکات میں واقعیت کا وزن نسبتاً کم درجے میں بھی محسوس ہو تو انہیں سنجیدگی سے مذہبی اور دینی جماعتوں کے ایک ایسے متحدہ محاذ کی داغ بیل ڈالنے کا بیڑا اٹھانا چاہئے جو اس ملک خداداد میں ایک مثالی اسلامی ریاست کے قیام کے لئے پتامار کر کام کرنے کا فیصلہ کرے..... وقتی اور فوری مسائل پر بھی اسلام ہی کے حوالے سے بات کرے' اپنی صفوں میں صرف ان لوگوں کو جگہ دے جو دین سے فکری اور عملی ہم آہنگی رکھتے ہوں اور حصول مقصد کے لئے روایا ناروا ہر طرح کی تدبیریں اختیار کرنے اور حب عاجلہ میں "شارٹ کٹ" راستے آزمانے سے پوری طرح پرہیز کرے۔ ہمیں اپنے ہم وطنوں کی دین سے عملی وابستگی کا حال خوب معلوم ہے تاہم اس پہلو سے قدرے دل گرفتگی کے باوصف ہم امید رکھتے ہیں کہ خواص اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں تو عوام میں بھی جلد یا بدیر یہ اجتماعی ارادہ پیدا ہو کر رہے گا کہ انہیں مسلمان جینا اور مسلمان مرنا ہے۔ ہمارا مجوزہ مذہبی متحدہ محاذ اس ارادے کو پیدا کرنے اور اسے صحیح سمت میں لگانے کا کام ہمدردی و دلسوزی سے کرے تو اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت ساتھ دے گی اور ہماری آنکھوں کو اس منظر سے ٹھنڈک مل کر رہے گی کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے عطاء کردہ اس قطعہ ارضی میں اسی کا کلمہ بلند ہو۔ اور یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ملک کی بقاء و سلامتی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اس شمارے میں مدیر میثاق اور امیر تنظیم اسلامی' جناب ڈاکٹر اسرار احمد کا وہ خطاب جمعہ شامل ہے جس میں انہوں نے ناروے میں علامہ اقبال مرحوم کے بارے میں صدر آزاد کشمیر جناب سردار عبدالقیوم کی ناروا باتوں پر تفصیلی گفتگو کی۔ تاہم چونکہ سردار صاحب کے جذبات

میں بہہ جانے کا باعث پسر اقبال جناب جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے بعض نظریات بنے تھے لہٰذا ضمنی طور پر کچھ تبصرہ ان پر بھی اس خطاب میں آ گیا ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی تصوراتی سیکولر سٹیٹ کو مثالی اسلامی ریاست کہنا چاہتے ہیں تو شوق سے کہیں لیکن اسے علامہ اقبال سے منسوب کرنے کا ستم براہ کرم نہ ڈھائیں۔ اسلام کے ساتھ سیکولرازم کا رشتہ جوڑنا تو نور اور ظلمت کو یکجا کرنے کے مترادف ہے۔ برادرم ڈاکٹر ابصار احمد کا مقالہ "اسلام اور سیکولرازم" جو قبل ازیں 'حکمتِ قرآن' میں چھپ چکا ہے، خواہش تو یہ تھی کہ اسی اشاعت میں شامل ہوتا لیکن جگہ نہ ہونے کے باعث آئندہ شمارے میں شامل اشاعت کیا جائے گا، ان شاء اللہ اس موضوع پر اُن بہت سی الجھنوں کو دُور کرنے کا سبب بنے گا جو ہمارے تجدد پسند دانشوروں نے لکھے پڑھے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کر دی ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

"میثاق" کے ادارۂ تحریر کی روح رواں اور ہمارے سب سے معمر و محترم ساتھی، جناب شیخ جمیل الرحمٰن، صاحب فراش ہیں۔ لاہور میں اپنی ذمہ داریوں سے انصاف کرتے ہوئے جسم و جاں کی حق تلفی کر کے پچھلے ماہ وہ اپنے گھر کراچی پہنچے تو طبیعت ناساز تھی۔ علامات کی شدت اور نوعیت انہیں امراض قلب کے ہسپتال لے گئی اور معلوم ہوا کہ "انجائنا" کا شکار ہیں۔ علاج اپنی جگہ، ان کے لئے سب سے بڑھ کر سوہان روح یہ ہدایت ہے کہ ہمہ وقت بستر پر دراز رہیں اور ہر طرح کی جسمانی و ذہنی مشقت سے مکمل پرہیز کریں۔ دواؤں کا استعمال تو جاری ہے لیکن لکھنے پڑھنے کے جو کام انہوں نے اپنے ذمے لے رکھے ہیں انہیں بھی کسی نہ کسی حد تک نبھائے لئے جانے کی کوشش سے باز نہیں آئے۔ بلکہ لاہور آ کر حسب سابق کام کرنے کے لئے بھی تڑپتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ عمر عزیز کا جو حصہ بھی بچا ہوا ہے وہ دین ہی کے کام میں لگے۔ ہم سب اللہ تعالیٰ کے حضور دست بدعا ہیں کہ انہیں صحت و توانائی اور عمر کی مہلت ملے اور پھر یہ سب کچھ اسی کے دین کی سرفرازی کی سعی میں کام آئے۔ قارئین کرام سے بھی خصوصی درخواست ہے کہ اپنی دعاؤں میں بزرگوار شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کو ضرور یاد رکھیں۔

●●●●●

ڈاکٹر اسرار احمد

تذکرہ و تبصرہ

آج بہت طویل عرصے کے بعد 'تذکرہ و تبصرہ' کے عنوان کے تحت قارئین 'میثاق' سے براہ راست مخاطبت کا شرف حاصل کرنے کے لئے قلم ہاتھ میں لیا ہے..... اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری زبان اور قلم سے حق ہی نکلوائے' اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں حق کے سننے اور قبول کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائے۔ آمین!

' جماعتِ شیخ الہندؒ اور تنظیمِ اسلامی' تا حال تنظیمِ اسلامی کے سلسلۂ مطبوعات کی ضخیم ترین کتاب ہے (مشتمل بر ۶۵۶ صفحات)۔

راقم نے اس کتاب کا مواد 'میثاق' اور 'حکمت قرآن' کے فائلوں سے نکال کر اوائل رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ (مطابق اوائل مئی ۱۹۸۷ء) میں مرتب کر دیا تھا۔ رمضان کے آخری عشرے میں سرزمین حرم میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی تو وہاں اس کا مقدمہ ضبطِ تحریر میں آیا۔ الغرض' اواخر جون تک کتاب راقم کی جانب سے برائے طباعت و اشاعت تیار ہو چکی تھی۔ تاہم کارکنانِ مکتبہ نے اس پر دو ماہ مزید لئے'..... اور بالآخر جب اواخر اگست میں راقم سے دریافت کیا گیا کہ اسے کتنی تعداد میں طبع کرانا ہے تو خیال آیا کہ عوام کی دلچسپی کی تو یہ چیز ہے ہی نہیں' رہے علماء تو ان کی اکثریت گروہی عصبیت کے حصار میں محصور ہے' پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اتنی ضخیم کتاب بعض حضرات کی قوتِ خرید کے دائرے میں نہ آ سکے' لہٰذا اولاً راقم نے صرف گیارہ صد کا فیصلہ کیا..... لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ یہ یقیناً من جانب اللہ تھا کہ دفعتہً دل کی کیفیت بدلی اور راقم نے تعداد ایک دم دوگنا کر دی یعنی ۲۲۰۰'..... اس پر اچھی طرح یاد ہے کہ ناظم مکتبہ بھی قدرے حیران ہوئے تھے تاہم انہوں نے بھی زیادہ پس و پیش

سے کام نہ لیا' اور کتاب دو ہزار دو صد کی تعداد میں تیار ہو کر اواخر ستمبر ۸۷ء میں مکتبے میں آ گئی۔

آج سے لگ بھگ پندرہ روز قبل جب شکاگو سے رفیقِ محترم ڈاکٹر خورشید ملک تشریف لائے اور انہوں نے اس کتاب کے کچھ نسخے بھارت اور کچھ امریکہ لے جانے کی خواہش کے تحت مکتبے سے رابطہ کیا تو میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب یہ معلوم ہوا کہ کتاب تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ چنانچہ ان الفاظ کی تحریر کے وقت جبکہ کتاب کی اشاعت کو چار ماہ بھی پورے نہیں ہوئے' مرکزی مکتبے میں کتاب کے کل ۱۶۰ نسخے موجود ہیں' اور زیادہ سے زیادہ اتنے ہی یا کچھ کم و بیش تعداد میں یہ کتاب مختلف شہروں میں تنظیم کے ذیلی مکتبوں میں موجود ہو گی..... گویا چار ماہ سے کم مدت میں اس کتاب کے دو ہزار نسخے قارئین تک پہنچ چکے ہیں!

اس سے چونکہ راقم الحروف کا حوصلہ بڑھا ہے..... اور اس کی ہمت افزائی ہوئی ہے اور اُسے مختلف النوع مایوسیوں کے "ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" ایسے تہہ بر تہہ اندھیروں میں امید کی ایک روشن کرن نظر آئی ہے' لہٰذا مناسب محسوس ہوا کہ اس کیفیت میں جملہ رفقائے تنظیم اور قارئین 'میثاق' کو بھی شریک کیا جائے' اسی لئے یہ پوری تفصیل گوش گذار کر دی گئی!

رہا یہ امر کہ اس کتاب کے دو ہزار نسخوں کے دین کا درد رکھنے والے لوگوں تک پہنچ جانے سے کوئی عملی نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے یا نہیں' اور "علماءِ ربّانیین اور بالخصوص منتسبینِ حضرت شیخ الہندؒ" کے مختلف حلقوں میں سے کسی کی جانب سے بالفعل دستِ تعاون دراز ہوتا ہے یا نہیں' تو اس کا تمام تر تعلق مشیّتِ ایزدی سے ہے کہ "اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا" کے مطابق ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے بارے میں اللہ کا فیصلہ کیا ہے۔ اس معاملے میں ہمارے لئے تو صبر و استقامت اور تسلیم و رضا کے سوا کوئی اور راہ نہ ممکن ہے' نہ درست!

کتاب کے بعض قارئین کا یہ شکوہ بعض ذرائع سے راقم تک پہنچا ہے کہ اسے نیوز پرنٹ پر طبع کر کے زیادتی کی گئی ہے۔ اس 'زیادتی' کا پس منظر تو سطورِ بالا میں سامنے آ ہی گیا ہے' آئندہ کے لئے یہ وعدہ ہے کہ انشاء اللہ اس کا دوسرا ایڈیشن سفید کاغذ پر طبع ہو گا۔

اس کتاب میں راقم الحروف نے اس حقیقت کا نہ صرف اقرار و اعتراف کیا ہے بلکہ ببانگِ دہل اظہار و اعلان کیا ہے کہ:

۱۔ اگرچہ راقم کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی بہت سی علمی آراء اور جماعتِ اسلامی کی قیام پاکستان کے بعد کی مجموعی حکمتِ عملی سے شدید اختلاف ہے..... تاہم راقم کی مساعی اُن کی 'تحریکِ اسلامی' ہی کا تسلسل ہیں!

۲۔ مولانا مودودی مرحوم پر بھی اس تحریک کے اصول و مبادی نہ وحیٔ آسمانی کے طور پر نازل ہوئے تھے 'نہ وہ اصلاً و کُلّیتہً' اُن کے اپنے ذہن و فکر کی اختراع تھے..... بلکہ اُن کی اصل نسبت ہے 'الہلال' اور 'البلاغ' والے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور اُن کی قائم کردہ 'حزب اللہ' کی جانب!..... تو اگرچہ راقم کو مولانا آزاد مرحوم کے بھی بہت سے نظریات سے شدید اختلاف ہے تاہم تحریکِ اسلامی کے اصول و مبادی کے اعتبار سے وہ اپنے آپ کو ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے مولانا آزاد مرحوم سے بھی منسلک سمجھتا ہے۔

۳۔ اور چونکہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے..... جو راقم کے نزدیک چودھویں صدی ہجری کے مجددِ اعظم ہیں..... ایک جانب: مولانا آزاد کے بارے میں مثبت طور پر یہ فرما کر کہ "اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے" اور اُن کے معترضین کے جواب میں یہ شعر پڑھ کر کہ "کامل اس طبقۂ زُہّاد سے اٹھا نہ کوئی۔ کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے!" اُن کے افکار و خیالات اور ان کی مساعی کی تحسین و تصویب فرما دی تھی اور دوسری جانب: ۱۹۲۰ء میں مولانا آزاد کی امامتِ ہند کی تجویز کی پرزور تائید ہی نہیں اصلاً اس کی تحریک فرما کر انہیں گویا اپنا 'خرقۂ خلافت' عطا فرما دیا تھا' لہٰذا راقم اپنے آپ کو حضرت شیخ الہندؒ سے بھی منسلک سمجھتا ہے!

کتاب کی اشاعت سے قبل اس کا مقدمہ 'میثاق' بابت جولائی ۸۷ء میں شائع ہوا تو مندرجہ بالا نکاتِ ثلاثہ میں سے آخری نکتے کے ضمن میں ایک تنقیدی ہی نہیں تردیدی مضمون ہمیں مظفر آباد (آزاد کشمیر) کے ایک عالم دین مولانا محبوب الرحمٰن صاحب کی جانب سے ملا۔ مضمون کے اصل مشمولات سے قطع نظر اُس کا آغاز و اختتام دونوں نہایت تیکھے انداز کے

حامل تھے لیکن اس کے ساتھ جو خط آیا اس کا انداز بہت مختلف تھا۔ جو درج ذیل اقتباس سے ظاہر ہے :

"حضرتِ شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کے حوالہ سے مولانا آزاد کے حق میں امامت کی بیعت کا معاملہ اس سے قبل میثاق کے کئی شماروں میں آ گیا ہے۔ آپ کا پختہ موقف ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ مولانا آزاد کو امام الہند کے منصب کے لئے موزوں سمجھتے ہوئے انہیں امام و خلیفہ قرار دے چکے تھے۔ اگرچہ اس موضوع کے حق و مخالفت میں دو رائے موجود رہی ہیں۔ تاہم تحریکِ خلافت کے ضمن میں راقم نے جو واقعات مطالعہ کئے ہیں۔ انہیں ایک مضمون کی شکل میں تحریر کر کے ارسال کر رہا ہوں۔ یہ خوبی صرف آپ میں نظر آئی ہے کہ آپ اپنے مخالف کی رائے کو بھی اپنے مجلّہ میں جگہ دیتے ہیں۔ خدا را مجھے آپ اپنا مخالف نہ سمجھیں بلکہ آپ کا مداح ہوں۔ مجھے حضرت شیخ الہندؒ کی جلالت شان اور مولانا آزاد کی عبقریت کا بھی اعتراف ہے۔ اس کے باوجود تاریخی واقعات کو چُھپایا نہیں جا سکتا۔ امید ہے یہ مضمون قارئین میثاق کی نظر سے آئندہ ضرور گذرے گا"۔

اس کے جواب میں راقم نے انہیں لکھوایا کہ "میری خواہش ہے کہ اس کی اشاعت سے قبل آپ سے ملاقات کا اہتمام ہو جائے تاکہ اسی موضوع پر جو مزید سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کے جواب کو بھی آپ اس مضمون میں شائع کر سکیں"..... راقم کا خیال تھا کہ مولانا موصوف نے صرف 'مقدمہ' پڑھا ہے'..... میری رائے جس اساسی مواد پر قائم ہے (جواب کتاب کے باب دوم میں شامل ہے) وہ اُن کی نظر سے نہیں گذرا۔ ملاقات میں یہ چیزیں بھی سامنے آ جائیں گی تو وہ اپنی رائے پر ضرور نظر ثانی کر لیں گے..... چنانچہ ملاقات کے لئے بھی راقم نے یہ لکھوا دیا تھا کہ میں ۱۷ اگست ۸۷ء کو اسلام آباد آ رہا ہوں 'اگر آپ وہاں تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمالیں تو بہت اچھا رہے'

اس پر مولانا کا ایک مفصّل مکتوب موصول ہوا جس میں سفر سے معذوری کے اظہار کے ساتھ اپنے مضمون کی اشاعت پر شدید اصرار تھا..... جس میں دوبارہ یہ متحدانہ انداز بھی موجود تھا کہ "اس مضمون کے سلسلے میں ممکن ہے کہ محترم المقام ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں کچھ

سوالات ابھرے ہوں لیکن اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس مضمون کو 'میثاق' میں شائع کر کے ڈاکٹر صاحب اپنے سوالات بھی شائع کر دیں' اس کے بعد تقابل سے صحیح بات خود سامنے آ جائے گی۔" لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ مخلصانہ اور ناصحانہ انداز بھی موجود تھا کہ "ڈاکٹر صاحب تحریک تنظیم اسلامی کے سلسلے میں جو بیعت لے رہے ہیں اس کے حق میں قرآن اور حدیث سے دلائل موجود ہیں (البتہ) اس کے لئے مولانا آزاد کی بیعت بطور امام الہند کا جو شیخ الہندؒ کے حوالے سے انہوں نے سہارا لیا ہے میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب ایک خلافِ واقعہ بات کا سہارا لے رہے ہیں..... ڈاکٹر صاحب سے دو بار یہاں ملاقات ہوئی ہے۔ موصوف کے خطاب بھی سنے ہیں اور 'میثاق' کے ذریعے روحانی غذا مل جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب جس راہ پر گامزن ہیں وہ بڑی کٹھن راہ ہے' بس اللہ کی مدد چاہئے' انہیں اللہ تعالیٰ نے بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے' ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی نصرت فرمائے!"..... اس خط سے ایک مزید مفید بات جو معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ اپنی اس تحریر کے لئے انہوں نے تمامتر مواد قاضی عدیل احمد عباسی کی تالیف 'تحریک خلافت' سے لیا ہے!

اس کے جواب میں راقم نے خواہشِ ملاقات کے مکرّر اظہار کے ساتھ اُنہیں تحریر کرا دیا تھا کہ "آپ کا مضمون ان شاء اللہ العزیز 'میثاق' میں شائع ہو گا..... توقع ہے کہ دو تین ماہ تک اس کے لئے گنجائش پیدا ہو سکے گی۔" ساتھ ہی انہیں "میثاق" کا وہ پرانا پرچہ بھی بھجوا دیا تھا جس میں راقم کی تحریر "مولانا ابوالکلام آزاد..... جمعیت علماءِ ہند اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ" شائع ہوئی تھی۔

جواباً انہوں نے بھی 'تحریکِ خلافت' کے متعلقہ صفحات کی فوٹو سٹیٹ نقل ارسال کر دی اور رفیق مکرم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے نام خط میں اپنی اس نصیحت کا اعادہ فرمایا کہ..... "اصل بات آپ سے کہنے کے لائق یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے خواہ مخواہ مولانا آزاد کے دعویٰ امام الہند کا سہارا لیا ہے۔ اس کو ترک کرنا بہتر ہے' شیخ الہند کی شخصیت بجائے خود بڑی اہم ہے۔ ان کے مشن کو اگر جاری رکھا جائے تو قابلِ تحسین ہے اس کے لئے مولانا آزاد کو درمیان میں لانے کی ضرورت نہیں۔"

راقم معذرت خواہ ہے کہ مولانا کے مضمون کی اشاعت میں کچھ زیادہ تاخیر ہو گئی۔ (اُن

سے وعدہ دو تین ماہ کا تھا لیکن فی الواقع تاخیر ۲ + ۳ = ۵ ماہ کی ہو گئی!)..... بہر حال اس اشاعت میں راقم اپنے وعدے کے بوجھ سے سبکدوش ہو رہا ہے! اور مولانا کی تحریر من و عن شائع کی جا رہی ہے۔

اس کے ساتھ ہی اس مضمون پر مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ 'شیخ التفسیر جامعۂ رحیمیہ' دہلی' کا مختصر تبصرہ بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ مولانا ان دنوں پاکستان تشریف لائے ہوئے ہیں اور یہ اُن کا فوری اور سرسری تبصرہ ہے'..... ان کا وعدہ ہے کہ وہ دہلی واپسی پر اس موضوع پر ایک مبسوط تحریر مع حوالہ جات عنایت فرمائیں گے!

جہاں تک راقم الحروف کا تعلق ہے' اسے جو کچھ عرض کرنا تھا وہ " جماعتِ شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی " کی صورت میں سامنے آ چکا ہے لہٰذا وہ اس بحث کو جاری رکھنے کا ہرگز خواہش مند نہیں ہے' یہی وجہ ہے کہ جب کہروڑ پکا (ضلع ملتان) کے مولانا محمد ایاز ملکانوی صاحب کا خط آیا جس میں وہی باتیں دہرائی گئی تھیں جن کی وضاحت کی جا چکی ہے تو راقم نے سکوت ہی مناسب سمجھا۔ لیکن مولانا محبوب الرّحمان صاحب کی تحریر سے اندازہ ہوا کہ مولانا آزاد مرحوم کی ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۰ء کی سرگذشت کے ضمن میں دو بیعتوں کے مابین خلطِ مبحث کی بناء پر شدید مغالطہ پیدا ہو رہا ہے جو مولانا محبوب الرحمٰن کی طرح ہو سکتا ہے کہ اور بھی بہت سے حضرات کو لاحق ہوا ہو..... بلکہ اب احساس ہوتا ہے کہ خود مولانا ایاز ملکانوی نے راقم پر 'امام الباکستان' بننے کی خواہش کی جو پھبتی چست کی تھی اس کی پشت پر بھی یہی غلط فہمی کارفرما تھی'..... لہٰذا مناسب ہے کہ اس کے بارے میں کچھ وضاحت کر دی جائے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی ایک بیعت وہ تھی جس کی اساس پر انہوں نے ۱۹۱۳ء میں 'حزب اللہ' قائم کی۔ اسے بیعتِ امارت تو کہا جا سکتا ہے' بیعت امامت نہیں! اس لئے کہ اس وقت 'امامتُ الہند' کا کوئی تصور سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ یہ بیعت اصلاً دین کے اجتماعی تقاضوں کی ادائیگی کے لئے منظم جدوجہد کی خاطر ایک تنظیم یا جماعت کی تأسیس کے لئے تھی' اور راقم الحروف تنظیمِ اسلامی اور اس میں شمولیت کی خاطر اس کے امیر سے بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف کا رشتہ اگر جوڑتا ہے تو وہ اس بیعت سے ہے نہ کہ اس دوسری بیعت سے ہے جس کا

ذکر بعد میں آئے گا! اس 'بیعتِ تنظیم' کے لئے علماء کے کسی نمائندہ اجتماع میں تجویز و تائید اور اجتماعی فیصلے (RESOLUTION) کی کوئی ضرورت نہ کبھی پہلے تھی نہ اب ہے! اس لئے کہ اس نوع کی بیعت کی اصل حقیقت صرف یہ ہے کہ ایک شخص کے دل میں دین کی خدمت کا داعیہ' اور اس کی دعوت و شہادت اور غلبہ و اقامت کے لئے تن من دھن وقف کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے..... اور وہ اللہ کی تائید و توفیق کے بھروسے پر اوّلاً خود کمر کس کر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر لوگوں کو پکارتا ہے کہ "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہ !" تو جو لوگ اس کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے اس کے اعوان و انصار اور دست و بازو بننا منظور کر لیتے ہیں وہ اُس کے ساتھ اِس بیعت کے رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح ایک جمعیت یا جماعت وجود میں آ جاتی ہے جس کے امیر کی حیثیت بنیادی نوعیت کے اعتبار سے بالکل وہی ہوتی ہے جو اُس شخص کی جسے کچھ لوگ فرمانِ نبویؐ کے مطابق کسی سفر کے لئے اپنا امیر بنالیں۔ بہرحال ایسی کسی تنظیم یا جماعت کے قیام کے بعد اگر اللہ کی تائید و نُصرت شاملِ حال رہتی ہے تو تنظیم کو وسعت اور تحریک کو قوّت بھی حاصل ہوتی ہے اور جس درجہ میں اللہ کو منظور ہوتا ہے کامیابی بھی حاصل ہو جاتی ہے' ورنہ یہ دعوت اور تحریک آئندہ آنے والوں کے لئے کچھ نقوشِ پا چھوڑ کر ختم ہو جاتی ہے

برِعظیم پاک و ہند میں تیرھویں صدی ہجری میں اس کی نہایت شاندار مثال تحریکِ شہیدینؒ کی صورت میں سامنے آتی ہے جو 'بیعتِ شخصی' کی ٹھیٹھ دینی اساس پر برپا ہوئی تھی۔ چودھویں صدی ہجری میں یہی کام نہایت وسیع پیمانے پر' اگرچہ حالات کے تقاضوں کے مطابق درپردہ انداز میں حضرت شیخ الہندؒ کر رہے تھے' لیکن اُن کی زندگی کے آخری دور میں اس کا بیڑا آزادانہ طور پر (INDEPENDENTLY) اور برملا انداز میں اٹھایا مولانا ابوالکلام آزادؒ نے 'الہلال' کی زور دار دعوت اور بیعتِ شخصی کی اساس پر 'حزب اللہ' کے قیام کے ذریعے ..... اور پھر جب وہ کچھ عرصہ بعد مختلف اسباب کی بنا پر بددل ہو کر اس نہج سے دست کش ہو گئے تو اس کے تسلسل کو قائم رکھا مولانا مودودی مرحوم اور اُن کی قائم کردہ 'جماعتِ اسلامی' نے..... اگرچہ اس میں تنظیمی اساس 'بیعتِ شخصی' کو نہیں بلکہ 'بیعتِ دستوری' کو بنایا گیا تھا..... اور چونکہ راقم الحروف کے نزدیک جماعتِ اسلامی پاکستان بھی ملکی سیاست اور انتخابات کی دلدل میں پھنس کر اُس اصولی اسلامی تحریک کے راستے

سے منحرف ہو گئی' لہٰذا اُس نے اس خلا کو پورا کرنے کے ارادے سے دوبارہ بیعتِ شخصی کی اساس پر 'تنظیم اسلامی' کی بنیاد رکھ دی!

مولانا آزاد مرحوم کے حوالے سے دوسرا اور مشہور تر معاملہ اُس 'بیعتِ امامت' کا ہے جو تجویز ہی کے درجہ میں رہ گئی اور کبھی بالفعل منعقد نہیں ہوئی۔ اس سے ان سطور کے عاجز راقم کی تمام تر دلچسپی یا تو ایک تاریخی واقعے کی حیثیت سے ہے' یا اس اعتبار سے کہ اُسے اِس کے تذکرے میں حضرت شیخ الہندؒ کی سیرت و شخصیت کی عظمت کی جھلک نظر آئی..... ورنہ خود اُس کا' یا اُس کی قائم کردہ تنظیم کا یا اس میں شمولیت کے لئے کی جانے والی بیعت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے!

یہ بیعت اگر بالفعل منعقد ہو جاتی تو اس کے نتیجے میں ہندوستان کی بیسویں صدی عیسوی کی سیاست کا رخ بالکل تبدیل ہو جاتا' اس لئے کہ اس سے جس جہادِ حرّیت کا آغاز فوراً ہو جاتا اُس میں مسلمانوں کا پلڑا فیصلہ کُن حد تک بھاری رہتا' اور چونکہ اس کی قیادت اصلاً علماء کے ہاتھوں میں ہوتی لہٰذا یہ بھی ہرگز بعید از قیاس نہیں ہے کہ اسی جہادِ حرّیت سے آگے چل کر غلبۂ اسلام اور اقامتِ دین کی راہ نکل آتی..... یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ اپنے مرضِ وفات کے آخری لمحات تک اس کے لئے' نہایت بے تاب اور شدید آرزومند رہے..... یہ دوسری بات ہے کہ مشیّتِ ایزدی کے آگے بڑے سے بڑے انسان کی تمنّا و آرزو بھی ؎ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!" کی مصداق بن کر رہ جاتی ہے..... چنانچہ اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا اور حضرت شیخ الہندؒ کی نیک آرزوئیں ان کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو گئیں۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن !

لب یہ ایک ظاہر و باہر حقیقت ہے کہ' پہلی بیعت یعنی بیعتِ حزب اللہ کے برعکس' اس دوسری مجوّزہ بیعت یعنی بیعتِ امامتِ ہند کی بیل کے منڈھے چڑھنے کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں تھا اگر اسے امّت کے سربرآوردہ زعماء اور نمائندہ علماء کے معتدبہ حصّے کی تائید اور پشت پناہی حاصل نہ ہوتی..... بلکہ یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ اگر کوئی عظیم شخصیت ابتداء ہی سے اس کی پشت پر نہ ہوتی تو اس تجویز کے باقاعدہ سامنے آنے اور کسی اہم اجتماع میں باضابطہ گفتگو کا موضوع بننے کا بھی کوئی امکان نہ تھا۔ چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ یہ تجویز جمعیت علماءِ ہند

کے دوسرے اجلاس منعقدہ دہلی، نومبر ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہندؒ کی خواہش اور ایماء ہی پر زیر بحث آئی۔

تاہم، جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، راقم کی اس معاملے سے تمام تر دلچسپی یا تو ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے ہے یا حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کی عظمت کے اعتبار سے ورنہ تنظیمِ اسلامی کی بیعت کا اس مجوزہ بیعت سے کوئی تعلق نہیں ہے.......... اس لئے بھی کہ راقم نے جس سفر کا آغاز کیا ہے اس کے عزم کا اصل مصدر و منبع اُس کا اپنا احساسِ فرض ہے اور اگرچہ وہ جملہ اکابر واصاغر اور ہر کہ ومہ سے تعاون کا خواستگار ہے اور بالخصوص اکابر علماء کے تعاون کو تو وہ ؎ "کہ ہرچہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است!" کی سی دلی کیفیت کے ساتھ قبول کرے گا خواہ وہ صرف دعائے خیر اور کلمۂ نصیحت ہی کی صورت میں ہو، تاہم اُس کا عزمِ سفر نہ کسی معیّن شخصیت یا طبقے کی تصویب پر منحصر ہے، نہ ہی کسی کے تعاون کیساتھ مشروط ہے۔ بلکہ وہ، انشاءاللہ العزیز، .... "یٰاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ" کی سی کیفیت کے ساتھ غلبۂ اسلام اور اقامتِ دین کے لئے تن، من، دھن کے ساتھ جدّوجہد کرتے ہوئے اپنے ربّ کے حضور میں حاضر ہو جائے گا، اور الحمدللہ کہ یہی اُس کے نزدیک اصل اور بڑی کامیابی ہے! (ذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ)...... اور اس لئے بھی کہ علماء کرام کی تائید و اتّفاق کے ساتھ یہ معاملہ ۱۹۲۰ء میں طے نہ پا سکا جبکہ سوائے ایک خانوادۂ بریلی کے، برِّعظیم ہند و پاک کے جملہ دینی مکاتب فکر جمعیت علماءِ ہند کے پلیٹ فارم پر جمع تھے اور حضرت شیخ الہندؒ ایسی عظیم ہستی اُس کی محرک و مجوز تھی، تو آج جبکہ تشتّت وانتشار کا عمل بہت آگے بڑھ چکا ہے اور "اِعْجَابُ کُلِّ ذِیْ رَأْیٍ بِرَأْیِه" کا مرض کہیں زیادہ شدّت اختیار کر گیا ہے، اس کی توقع کسی فاتر العقل انسان ہی کو ہو سکتی ہے!

البتہ جہاں تک اس واقعے کی واقعیّت اور حقّانیت کا تعلق ہے، وہ اس عرصے کے دوران راقم پر مزید یقین و اذعان کے ساتھ منکشف ہوئی ہے۔ اس لئے کہ اُس نے مولانا محبوب الرحمٰن صاحب کی تحریر کو دیکھنے کے بعد ایکؔ تو قاضی عدیل احمد عباسی کی تصنیف 'تحریکِ خلافت' کو حرفاً حرفاً پڑھا جو مولانا موصوف کا واحد ماخذ ہے، اور دوسرےؔ ڈاکٹر ابو سلمان

شاہجہانپوری کی تالیف ' تحریک نظمِ جماعت ' کا بالاستیعاب مطالعہ کیا' جس سے اس واقعے کے مختلف پہلوؤں پر مزید روشنی حاصل ہوئی۔ اور اگر مناسب فرصت میسر آ گئی تو راقم اپنے مطالعہ اور غور و فکر کے نتائج کو تفصیلاً قلم بند کرنے کی کوشش کرے گا۔ تاکہ ہمارے ماضیٔ قریب کی تاریخ کے وہ بعض اہم پہلو مزید نمایاں ہو جائیں جو مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ کے قول کے مطابق "اب تک پردۂ خفا میں تھے!" ..... سردست راقم نے مولانا قاسمی مدظلہٗ اور ڈاکٹر شاہ جہان پوری صاحب ہی سے درخواست کی ہے کہ اس موضوع پر تفصیلاً روشنی ڈالیں۔ چونکہ ان دونوں حضرات کا اصل شغل ہی تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف ہے' لہٰذا اُن کے لئے یہ کام چنداں مشکل نہیں ہے!..... بہرحال جیسے ہی ان حضرات کی جانب سے اس درخواست کے جواب میں کچھ موصول ہوا ہدیۂ قارئین کر دیا جائے گا!

(۲)

' جماعتِ شیخ الہندؒ اور تنظیمِ اسلامی ' کے مقدّمے میں' کتاب میں شامل بعض تحریروں اور تقریروں کے پس منظر کی وضاحت کے ضمن میں ایک نوجوان کا ذکر آیا تھا جس کے بارے میں یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ اپنی تحریر اور گفتگو کی صلاحیّت کی راہ سے امّت میں ایک نئے فتنے کا آغاز بن سکتا ہے..... ہمیں افسوس ہے کہ اس عرصے کے دوران وہ فتنہ پوری قوّت و شدّت کے ساتھ سامنے آ گیا ہے اور آج کل اُس کے ہاتھوں ایک قومی روزنامے کے کالموں میں فقہ اسلامی کے مجمع علیہ مسائل اور جلیل القدر فقہاء و محدّثین کی عزّت و آبرو کی دھجیاں بکھر رہی ہیں..... ہمیں اس پر ہرگز کوئی خوشی نہیں ہے کہ اس نوجوان کے بارے میں جو رائے ہم نے بہت پہلے قائم کر لی تھی وہ درست ثابت ہوئی' البتّہ اس عرصے کے دوران جن حضرات نے لاعلمی اور حسنِ ظن کی بنیاد پر اُن سے راہ و رسم پیدا کر لی تھی اور اس طرح اُن کو تقویت پہنچانے کا ذریعہ بن گئے تھے امید ہے کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو گا اور ہم یہ توقع کرنے میں حق بجانب ہیں کہ کم از کم اب وہ حضرات اُن سے براءت کا اظہار و اعلان کر دیں..... ہمارا روئے سخن بعض دوسرے علماء کے ساتھ ساتھ' بالخصوص مولانا سیّد وصی مظہر ندوی (حیدر آباد) کی جانب ہے' جن سے ہم نے اپنا تنظیمی تعلق اسی لئے منقطع کر لیا تھا کہ وہ اس نوجوان کے نیاز مندوں یا سرپرستوں کے حلقے میں شامل ہو گئے تھے!

اس نوجوان نے روزنامے میں اپنے کالم کا آغاز ایک طرف راقم الحروف اور تنظیم اسلامی اور دوسری جانب مولانا مودودی مرحوم اور جماعتِ اسلامی 'بیک وقت دونوں کو ہدفِ تنقید و ملامت بنا کر کیا تھا' اور 'اسلامی انقلاب' اور 'اقامتِ دین' کے لئے کی جانے والی مساعی پر مختلف النوع پھبتیاں چست کر کے 'خود کو مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کی وساطت سے "دبستانِ شبلیؒ" کے وارث و ترجمان کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔

اس پر راقم الحروف اور تنظیم اسلامی پر کئے جانے والے حملوں کا جواب رفیقِ محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے قلم سے 'اور مولانا مودودی مرحوم اور جماعتِ اسلامی پر کئے جانے والے حملوں کا جواب مولانا فتح محمد امیر جماعتِ اسلامی پنجاب کے قلم سے 'اُسی روزنامے میں شائع ہو گیا تھا۔ البتہ 'دبستانِ شبلیؒ' کے ضمن میں راقم نے اپنی ایک پرانی تحریر کے بارے میں ادارہ 'حکمتِ قرآن' کو ہدایت کر دی تھی کہ اُسے دوبارہ شائع کر دیا جائے تاکہ "دبستانِ شبلیؒ" کے بارے میں بعض اہم حقائق قارئین کے ذہن میں تازہ ہو جائیں۔ یہ تحریر اب سے لگ بھگ بیس (۲۰) سال قبل لکھی گئی تھی اور "میثاق" کے نومبر ۱۹۶۸ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی اور اس کے ایک ایک حرف کی تصویب و توثیق (تحسین اور استحباب کے اضافے کے ساتھ) مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے فرمائی تھی۔

راقم کو اُس وقت یہ خیال نہ رہا کہ اس میں مولانا مودودی مرحوم پر تنقید کے ضمن میں چند تلخ جملے بھی شامل ہیں چنانچہ جیسے ہی ستمبر ۱۹۸۷ء کے "حکمت قرآن" میں یہ تحریر شائع ہوئی اور اس پر معروف سندھی صحافی اور دانشور حافظ محمد موسیٰ بھٹو کا خط موصول ہوا جس میں اُس تحریر کے اصل نفسِ مضمون کی تحسین کے ساتھ یہ 'تنبیہ' بھی شامل تھی کہ:

> "..... 'علی گڑھ اور دیوبند کے مابین چند درمیانی راہیں' پڑھ کر آپ کے علمی مزاج اور تجزیاتی صلاحیت کا اندازہ ہوا اور آپ سے عقیدت میں اضافہ ہوا۔ البتہ مولانا مودودی کی شخصیت اور اُن کے کام کے بارے میں آپ کی رائے میں کچھ جارحیت اور سختی پائی جاتی ہے....."

تو راقم کی ہدایت پر 'حکمتِ قرآن' کے مرتب نے اگلی اشاعت کے 'حرفِ اوّل' میں محترم بھٹو صاحب کا خط بھی من و عن شائع کر دیا اور حسب ذیل وضاحت بھی شائع کر دی:

"محترم موسیٰ بھٹو کے اس خیال کے بارے میں کہ مولانا مودودی مرحوم و مغفور کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی پرانی تحریروں میں خاصی تلخی پائی جاتی ہے' ہم یہ عرض کریں گے کہ اس وقت ڈاکٹر صاحب کے لئے مولانا کی تحریک اسلامی کے غلط سمت مڑ جانے کا صدمہ تازہ تھا' زخم کی دکھن کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی تھی جس کا اظہار ان تحریروں میں ہوا ہے۔ اب اگر ڈاکٹر صاحب مولانا مرحوم کا ذکر تحریر و تقریر میں کرتے ہیں تو انداز تلخی اور تندی کی بجائے تاسف اور حسرت کا سا ہوتا ہے۔ اس معاملے کی وضاحت خود محترم ڈاکٹر صاحب بھی اپنی کتاب "اسلام اور پاکستان' کے دیباچے میں فرما چکے ہیں جو شاید محترم مکتوب نگار کی نظر سے نہیں گزری"۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس کے باوجود جماعت اسلامی کے حلقے کے جرائد نے نہایت تیز و تند ردِّ عمل کا اظہار کیا اور ہفت روزہ 'ایشیا' لاہور (۲۲ نومبر ۱۹۸۷ء) اور روزنامہ 'جسارت' کراچی نے ایک طویل و عریض مضمون شائع کر دیا جو اپنے انداز و اسلوب کے اعتبار سے "جاٹ رے جاٹ ترے سر پر کھاٹ!" کے جواب میں "تیلی رے تیلی ترے سر پر کولھو!" کا مصداقِ کامل ہونے کے علاوہ خلطِ مبحث اور اصل موضوع سے گریز کرتے ہوئے قارئین کو خواہ مخواہ کے اینچ پینچ میں الجھا دینے کی کوشش کا مظہرِ اتم بھی ہے!

حسنِ اتفاق سے ان ہی ایّام میں دفترِ "میثاق" کی جانب سے پرچے کے مضامین وغیرہ کے بارے میں قارئین کی رائے معلوم کرنے کے لئے جو مراسلہ جاری کیا گیا تھا اُس کے جوابات کے ذریعے بھی بہت سے حضرات کی یہ رائے سامنے آئی کہ مولانا مودودی پر تنقید سے احتراز کرنا چاہئے!

لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر بعض اصولی باتیں گوش گزار کر دی جائیں۔

اس اعتراض کا ایک نہایت سادہ اور عام فہم 'اگرچہ الزامی نوعیت کا حامل' جواب تو یہ ہے کہ جب مولانا مودودی مرحوم نے خود نہ صرف یہ کہ اپنے جملہ معاصرین پر شدید تنقیدیں کیں بلکہ ع "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!" کے مصداق اسلاف کو بھی نہ چھوڑا اور جملہ مجدّدین و مصلحین امّت کے علاوہ صحابہ کرامؓ پر بھی جارحانہ تنقیدیں کیں حتیٰ کہ انبیاء کرامؑ کے بارے میں بھی بے باکانہ طرزِ گفتگو سے احتراز نہ کیا تو آخر انہیں وہ کون سا تقدس حاصل ہے جس کا اس درجہ تحفّظ لازمی ہے؟

لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ جواب راقم کے حقیقی احساسات اور واقعی جذبات کا آئینہ دار نہیں ہے۔ اس معاملے میں راقم کے مزاج کی تشکیل جن آراء کی اساس پر ہوئی ہے اُن میں سے ایک یہ ہے کہ اس دورِ زوال میں جس شخص سے بھی کسی درجے کا کوئی خیر بن آیا ہو اور جو خدمت بھی اس نے دین وملت کی سرانجام دی ہو اس کا بھرپور اعتراف ہونا چاہئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُس کی خامیوں اور غلطیوں کو بھی واضح کر دیا جانا چاہئے تاکہ لوگ مغالطوں میں مبتلا ہونے سے بچ سکیں..... اور دوسری یہ کہ جیسے سنّتِ رسولؐ کے ضمن میں امّت کے تواترِ عمل کو بہت اہمیت حاصل ہے' اسی طرح ملّت کی تجدیدی واحیائی مساعی کا تسلسل بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے اور دین وملت کے ہر نئے خادم کو نہ صرف یہ کہ اسلاف کے ساتھ ذہناً اور قلباً منسلک رہنا چاہئے بلکہ اپنے بزرگوں میں سے جس جس سے بھی اُسے کوئی فیض حاصل ہوا ہو اس کا برملا اعتراف واظہار کرنا چاہئے!..... اگرچہ اُن کی جن جن باتوں سے اختلاف ہو انہیں بھی معیّن انداز میں واضح کر دینا چاہئے! تاکہ شخصیت پرستی کی لعنت کا سدّباب ہو سکے!

راقم کے نزدیک اپنے ہم عصر بزرگوں سے کسبِ فیض کے برملا اعتراف واعلان کی ضرورت واہمیت امّت کے تواتر وتسلسل' شرافت ومروّت کے تقاضوں اور فرمانِ نبویؐ "مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَا یَشْکُرُ اللّٰہَ" کی تعمیل کے علاوہ اس اعتبار سے بھی ہے کہ اگر کوئی خادم دین وملت ایسا نہ کرے تو اس کا شدید اندیشہ ہے کہ اگر اُس کی مساعی اور خدمات کے نتیجے میں اس کے قدر دانوں اور عقیدتمندوں کا حلقہ پیدا ہو جائے تو اس حلقے میں اُس کے بارے میں یہ تاثر قائم ہو جائے گا کہ اگر وہ خود براہ راست آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا تو کم از کم اس پر آسمان سے براہ راست وحی تو ضرور ہی نازل ہوتی رہی ہے!..... اور کون نہیں جانتا کہ امت کی تاریخ کے دوران اصلاحی اور احیائی تحریکوں کے مستقل فرقوں کی صورت اختیار کر لینے کا اصل سبب یہی رہا ہے!

ان سطور کے عاجز راقم کی اس سوچ اور اس کے مزاج کی اس ساخت کا نتیجہ ہے کہ اس نے ایک جانب اپنے مطالعہ وفہمِ قرآن کے پورے حدود اربعہ (یا ابعادِ اربعہ) کو واضح طور پر بیان کر دیا کہ وہ فیض یاب ہوا ہے اوّلاً مولانا مودودی اور مولانا آزاد سے' ثانیاً مولانا اصلاحی اور مولانا فراہی سے' ثالثاً ڈاکٹر رفیع الدین اور ڈاکٹر اقبال سے' اور رابعاً شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد

عثمانی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے (رحمہم اللہ !) اور دوسری جانب اپنی تحریک و تنظیم کے بارے میں ببانگ دہل اعلان کیا کہ وہ تسلسل ہے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی ' جماعت اسلامی ' اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی ' حزب اللہ ' کا کہ جسے سندِ تائید و توثیق حاصل ہو گئی تھی حضرت شیخ الہندؒ کی جانب سے !

راقم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جب وہ حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت بیان کرتا ہے تو جماعتِ اسلامی کے حلقے کے لوگ اسے دیوبندی حلقے کی " خوشامد " سے تعبیر کرتے ہیں اور جب وہ مولانا مودودی سے اپنی نسبت و تعلق کو نمایاں کرتا ہے تو وہ علماءِ دیوبند کو " جماعتیوں " کی خوشنودی کے حصول کی کوشش نظر آتی ہے..... چنانچہ نتیجہ وہی نکلتا ہے کہ ع "اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش !" اگرچہ اس کا سبب بھی بالکل وہی ہے کہ ع "میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند !" ..... چنانچہ راقم اللہ کو گواہ بنا کر اور اس تعم کا شکر ادا کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ اُس کی زبان و قلم سے غلط فہمی کی بناء پر تو یقیناً بہت سی باتیں خلافِ واقعہ صادر ہوئی ہوں گی ' الحمدللہ کہ آج تک اس نے نہ جان بوجھ کر کسی شخص یا حلقے کی خوشنودی کو مطمحِ نظر بنایا ہے نہ ہی کسی کی ناراضگی یا ناخوشی کا لحاظ کیا ہے ! بلکہ اللہ کے فضل و کرم سے ہمیشہ صرف اسی کی رضاجوئی اور اپنے ضمیر کے اطمینان کو مدِ نظر رکھا ہے۔ اور اُسے اس سے کوئی غرض نہیں رہی کہ کون خوش ہوتا ہے اور کون ناخوش !

ہاں ' لہجے اور اندازِ گفتگو کا معاملہ جدا ہے۔ نظری اور علمی طور پر راقم بھی خوب جانتا ہے کہ داعیانہ انداز میں تیزی و تندی اور فی الجملہ جارحیت نہیں نصح و اخلاص اور دلسوزی و خیر خواہی کو نمایاں ہونا چاہئے..... اور وہ اس ضمن میں مقدور بھر کوشش بھی کرتا ہے تاہم اس میدان میں اُسے اپنے مستقل عجز بیان کا بھی برملا اعتراف ہے..... اور وہ اس امر کا بھی انکار نہیں کرتا کہ وہ وقتی طور پر اشتعال میں بھی آجاتا ہے۔

چنانچہ مولانا مودودی مرحوم کے بارے میں اُسے صاف اقرار ہے کہ وہ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک شدید غم و غصے کی ملی جلی جذباتی کیفیت میں مبتلا رہا ہے ' لہٰذا اس کی اُس زمانے کی تحریروں میں اسلوبِ بیان اور اندازِ کلام کی حد تک ' زیادتی ' کا عنصر شامل رہا ہے..... اگرچہ اسے پورا اطمینان ہے کہ بحمداللہ اس دور کی تلخ ترین تحریروں میں بھی کوئی بات نہ خلافِ

واقعہ بیان ہوئی ہے نہ خلافِ حقیقت!

اپنی اس دور کی جُملہ تحریروں کے بارے میں 'الحمدللہ کہ' راقم نے ایک جامع دُستاویز' آج سے ٹھیک پانچ سال قبل قلمبند کر دی تھی جو راقم کی تالیف "اسلام اور پاکستان: تاریخی' سیاسی' علمی اور ثقافتی پس منظر" میں بطورِ مقدّمہ شامل ہے۔ ذیل میں اسے من و عن درج کیا جارہا ہے تاکہ وہ راقم کے تمام بہی خواہوں کی نظر سے گزر جائے' خصوصاً اس لئے کہ ــــــ جیسے کہ بعد میں ذکر ہو گا راقم کی اسی دور کی ایک اور تحریر کے دوبارہ شائع کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی ہے' لہٰذا اس کے ضمن میں یہ تحریر ایک پیشگی وضاحت کا کام دے گی:

"پیش نظر مجموعہ میری چند تحریروں پر مشتمل ہے جو ۶۸۔ ۱۹۶۷ء کے دوران ماہنامہ 'میثاق' لاہور میں "تذکرہ و تبصرہ" کے زیر عنوان شائع ہوئی تھیں۔

ان میں میں نے ایک جانب تحریک پاکستان کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لیا ہے اور دوسری جانب موجودہ پاک و ہند مسلم معاشرے میں مذہبی فکر کے جو مختلف حلقے پائے جاتے ہیں ان کے پس منظر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے..... لیکن میرے نزدیک ان کا اہم ترین گوشہ وہ ہے جس سے ان عظیم غلطیوں کا سراغ ملتا ہے جن کے باعث ہم اس حد درجہ افسوسناک صورت حال سے دوچار ہیں کہ جو ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اس میں ثلث صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں تاحال کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔

اس ضمن میں لامحالہ بعض شخصیتوں اور جماعتوں کے کردار پر تنقید بھی آئی ہے جس کی زیادہ شدت کا ظہور فطری طور پر ان ہی کے حق میں ہوا ہے جن سے احیاء اسلام اور اقامت دین کے ضمن میں سب سے زیادہ امیدیں وابستہ تھیں..... تاہم خدا گواہ ہے کہ ان کی توہین و تنقیص نہ اس وقت مقصود تھی جب یہ مضامین لکھے گئے تھے' نہ آج مطلوب ہے' بلکہ اصل معاملہ تب بھی وہی تھا اور اب بھی وہی ہے جو غالب کے اس شعر میں بیان ہوا کہ ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

پیش نظر مجموعے کی اشاعت سے قبل جب میں نے اپنی آج سے پندرہ سولہ سال قبل کی ان تحریروں کا جائزہ تنقیدی نگاہ سے لیا تو الحمدللہ کہ اس امر کا تو پورا اطمینان ہوا کہ ان میں حالات و واقعات کا جو تجزیہ سامنے آیا ہے وہ صد فی صد درست ہے البتہ یہ احساس ضرور ہوا کہ ان میں بعض مقامات پر طرز تعبیر اور انداز تحریر میں تلخی شامل ہو گئی ہے۔ جو نہ ہوتی تو بہتر تھا..... گویا اگر میں ان موضوعات پر آج قلم اٹھاؤں تو تجزیہ تو بنیادی طور پر وہی ہو گا لیکن انداز اتنا تلخ نہ ہو گا۔

لیکن اب ان تحریروں سے اس تلخی کو نکالنا نہ ممکن ہے نہ مناسب..... ممکن اس لئے نہیں

کہ وہ ان کے پورے تانے بانے میں بنی ہوئی ہے' اور مناسب یا درست اس لئے نہیں کہ پرانی تحریروں کو اگر پرانی تحریروں ہی کی حیثیت سے شائع کیا جائے تو ان میں رد و بدل تصنیف و تالیف کے اصولوں کے خلاف ہے..... اگر صاحب تحریر کی رائے میں بعد میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہو تو اسے اضافی حواشی کی صورت میں درج ہونا چاہئے یا علیحدہ وضاحت کی شکل میں!

اس ضمن میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے کہ ان کے ساتھ میرے ذہنی و قلبی تعلق میں اتار چڑھاؤ کی کیفیت شدت کے ساتھ واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کا آغاز شدید ذہنی و فکری مرعوبیت اور گہری قلبی محبت و عقیدت کے ساتھ ہوا۔ جس میں ذاتی احسان مندی کا عنصر بھی شدت کے ساتھ موجود تھا۔ لیکن پھر جب اختلاف پیدا ہوا تو وہ بھی اتنا ہی شدید تھا اور اس کے نتیجے میں طویل عرصے تک مایوسی ہی نہیں شدید بیزاری کی کیفیت قلب و ذہن پر طاری رہی لیکن آخر کار اس پر افسوس' ہمدردی اور حسرت کا رنگ غالب آ گیا اور قلب کی گہرائیوں میں کم از کم احسان مندی کے احساسات بہ تمام و کمال عود کر آئے..... میری پیش نظر تحریریں چونکہ ان تین ادوار میں سے درمیانی دور سے تعلق رکھتی ہیں لہٰذا ان میں تلخی کا رنگ بہت نمایاں ہے جس کے لئے میں مولانا مرحوم کے تمام محبین و معتقدین سے معذرت خواہ ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر ۷۹ء میں امریکہ میں مولانا سے میری ملاقات ہو جاتی جس کی ایک شدید خواہش لئے ہوئے میں وہاں گیا تھا تو میں ان سے بھی معافی حاصل کر لیتا..... اس لئے کہ اسی زمانے کے لگ بھگ مجھے ایک اطلاع ایسی ملی تھی جس سے پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ مولانا کے دل میں میری جانب سے کوئی تکدر یا رنج نہیں ہے۔ (یہ اطلاع جناب عبدالرحیم 'ڈپٹی چیف مکینکل انجینئر' کراچی پورٹ ٹرسٹ نے دی تھی کہ ایک نجی ملاقات میں جس میں وہ خود موجود تھے مولانا مرحوم نے میرے بارے میں یہ الفاظ فرمائے تھے کہ "اس شخص کے بارے میں مجھے یہ اطمینان ہے کہ وہ جہاں بھی رہے گا دین کا کام کرتا رہے گا!") جس کی تائید مزید مجھے بغلو میں مولانا کی نماز جنازہ میں شرکت کے موقع پر مل گئی جب مولانا کے خلف الرشید ڈاکٹر احمد فاروق مودودی سے معلوم ہوا کہ میری مولانا سے ملاقات کی خواہش یکطرفہ نہ تھی بلکہ' ان کے الفاظ میں "..... ادھر ابا جان بھی آپ سے ملاقات کے بہت خواہاں تھے لیکن....." بہرحال یہ میرا اور مولانا مرحوم کا ذاتی معاملہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ میدان حشر میں جب میں ان سے اپنی تلخ نوائی کی معافی چاہوں گا تو وہ مجھے ضرور معاف کر دیں گے۔

اس وقت اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم ماضی کے طرز عمل کا بھرپور تنقیدی جائزہ لیں اور اس میں نہ کسی کی محبت و عقیدت کو آڑے آنے دیں نہ کسی کے بغض و عداوت کو راہ پانے دیں' بلکہ یہ بے لاگ تجزیہ صرف مستقبل کے لئے سبق حاصل کرنے کے لئے ہو..... اور اس اعتبار سے ان شاءاللہ العزیز قارئین کرام ان تحریروں کو مفید پائیں گے۔

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ
لاہور' یکم جنوری ۸۳ء "

۱۹۷۰ء کے بعد مولانا مودودی مرحوم اور جماعتِ اسلامی کے بارے میں راقم کے قلبی احساسات وجذبات اور طرزِ گفتگو اور اندازِ بیان میں جو فرق واقع ہوا ہے' اس میں اوّلین دخل تو اس کا تھا کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں آرزوؤں اور امنگوں ہی نہیں' امیدوں اور توقعات کے بلند وبالا قصر کے ایک دم منہدم ہو جانے کے باعث حد درجہ دل شکستگی کی کیفیت مولانا مرحوم پر اور بے چارگی اور مسکنت کی کیفیت جماعتِ اسلامی پر طاری ہو گئی تھی...... چنانچہ یہ واقعہ راقم نے بارہا بیان کیا ہے (اور ممکن ہے کہ کہیں تحریر میں بھی آیا ہو) کہ فروری ۱۹۷۱ء میں حج کے موقع پر جب راقم نے مکّہ مکرّمہ میں برادرم زبیر عمر صاحب کے مکان پر مولانا مودودی کی اس تقریر کا ٹیپ سنا جو انہوں نے انتخابی شکست پر اپنے ہی حلقے کے بعض صحافی حضرات کے ناقدانہ تبصروں کے جواب میں کی تھی تو واقعہ یہ ہے کہ راقم اپنے آنسو بمشکل ہی ضبط کر سکا تھا!...... اس کے بعد مسلسل خبریں ملتی رہیں کہ مولانا پر علالت کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے لہٰذا اس کا بھی ایک فطری اثر طبیعت پر ہوا...... لیکن اس میں کچھ عرصہ کے بعد دوسرا فیصلہ کن عامل یہ شامل ہوا کہ مختلف ذرائع سے معلوم ہوا کہ مولانا کی سوچ تبدیل ہو گئی ہے اور اب وہ پاکستان میں انتخابات کی راہ سے 'اقامتِ دین' کا کوئی امکان نہیں سمجھتے بلکہ سابقہ انقلابی طرزِ عمل ہی کی جانب رجوع کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں کچھ اُن داخلی نفسیاتی حجابات کے باعث جو ایک طویل عرصے کے فصل وبُعد سے پیدا ہو گئے تھے اور کچھ ان 'اطلاعات' کی بنا پر کہ مولانا پر جماعت کی "بیوروکریسی" نے تہ بر تہ پہرے قائم کئے ہوئے ہیں' ان سے براہِ راست توثیق تو حاصل نہ کی جا سکی۔ (یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۹ء میں راقم اپنے پہلے سفرِ امریکہ پر یہ خواہش دل میں لئے ہوئے گیا تھا کہ اگر ممکن ہوا تو وہاں مولانا سے ملاقات کروں گا جس کا ذکر اوپر کے حوالے میں آ چکا ہے) البتہ اس کا نتیجہ وہ نکلا جو اوپر ان الفاظ میں سامنے آ چکا ہے کہ غم وغصّے کی کیفیت پر "حسرت اور ہمدردی کا رنگ غالب آ گیا اور قلب کی گہرائیوں میں کم از کم احسان مندی کے احساسات بہ تمام وکمال عود کر آئے!"

اس کیفیت میں مزید اضافہ مولانا کے انتقال کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فرمودات کے مطابق ہوا کہ "اُذکُروا موتَا کُم بالخیر"...... اور "لاتسُبّوا الاموات فانھم قد افضوا اِلیٰ ماقدّمُوا" یعنی "اپنے فوت شدگان کا ذکر خیر

ہی میں کیا کرو" اور "فوت شدگان کو برا بھلا مت کہو' اس لئے کہ وہ تو اپنے اُن اعمال کے پاس پہنچ ہی چکے ہیں جو انہوں نے آگے بھیجے تھے!"..... !!

لہٰذا اب اگر کبھی میری تحریر یا تقریر میں مولانا مودودی کا ذکر تنقیدی انداز میں آتا ہے تو وہ صرف شدید ترین ضرورت کے احساس ہی کے تحت آتا ہے اور حتی الامکان محتاط ترین الفاظ ہی استعمال ہوتے ہیں۔ رہا گذشتہ تحریروں کا معاملہ تو اگرچہ ان کے انداز اور اسلوب کے بارے میں ایک عمومی معذرت میں پانچ سال قبل کر چکا ہوں' تاہم ان کے نفسِ مضمون کے بارے میں بحمد اللہ مجھے پورا اطمینان ہے کہ میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی۔

چنانچہ میری جس تحریر پر جماعتِ اسلامی کا حلقۂ صحافت آتش زیر پا ہوا ہے اس کے بھی نفسِ مضمون (CONTENTS) کی پوری ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا بارِ ثبوت اپنے سر لیتے ہوئے اس کے دلائل و شواہد پیش کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اُس کا حاصل کیا ہو گا؟..... اور اس کا فائدہ کس کو پہنچے گا؟..... لہٰذا سر دست راقم ان تفاصیل میں جانے کی بجائے جماعت کے احباب کی خدمت میں چند اصولی گذارشات پر اکتفاء کر رہا ہے۔

اور وہ یہ کہ جب آپ حضرات کو بھی اقرار ہے کہ مولانا مرحوم نہ فرشتہ تھے کہ بشری کمزوریوں سے مبرّا ہوں' نہ نبی تھے کہ معصوم عن الخطا ہوں۔ تو آپ کسی کی جانب سے اُن کی کسی کمزوری یا غلطی کی نشاندہی پر اس قدر حساسیّت کا مظاہرہ کیوں کرتے ہیں کہ جیسے معترض یا ناقد کو تو چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے اور اپنے ممدوح' کو سُبُّوح اور قدّوس ثابت کر کے رہیں گے؟..... اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو ذہانت و فطانت بھی وافر عطا فرمائی تھی' اور زبان و قلم کی استعدادات سے بھی پوری فیاضی سے نوازا تھا..... پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے دین کی خدمت کے جذبے سے سرفراز فرمایا تھا' لیکن اس سب کے باوصف وہ بھی انسان ہی تھے اور عام انسانوں ہی کے مانند پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے چنانچہ انہوں نے بھی اپنے ماحول اور گرد و پیش ہی سے علم و فہم حاصل کیا تھا اور تربیت پائی تھی۔ اور جس طرح ہر انسان اپنے بزرگوں سے کسبِ فیض کرتا ہے اسی طرح انہوں نے بھی قدیم اسلاف کے ساتھ

ساتھ اپنے سے ایک نسل پہلے کے بہت سے اشخاص سے تحریر وانشاء کا اسلوب، فکر ونظر کی جلا، مقاصد واہداف کا شعور اور سعی وجہد کا انداز اخذ کیا تھا..... اور ان میں سے کسی چیز میں بھی اُن کی توہین کا کوئی پہلو موجود نہیں ہے..... اس پر اگر راقم نے یہ عرض کر دیا تھا کہ مولانا نے اس اخذ وکسب کے ضمن میں اعتراف واظہار اور تشکّر وامتنان کے ضمن میں بخل سے کام لیا ہے، تو اس پر اس درجہ مخبوط الحواس ہونے کی کیا ضرورت تھی کہ:

(۱) راقم کے زمانہ قیام ساہیوال کے دروسِ قرآن کے مآخذ میں 'تفہیم القرآن' کے ساتھ ساتھ 'تدبّرِ قرآن' کا نام بھی ٹانک دیا گیا حالانکہ ساہیوال میں میرے درس قرآن کی مقبولیت کا زمانہ ۵۶۔ ۱۹۵۵ء کا ہے، جب ساہیوال میں تو جماعتِ اسلامی کے ہفتہ وار اجتماع کے علاوہ بھی میرے متعدد دروس ہوتے تھے، ایک ایک ماہانہ درس قرآن کا اہتمام جماعت اسلامی حلقہ اوکاڑہ نے اوکاڑہ، عارف والہ اور پاکپتن میں بھی کیا تھا..... جبکہ 'تدبر قرآن' کی تسوید کا آغاز بھی ۱۹۵۹ء میں ہوا.....

(۲) علامہ نیاز فتح پوری سے مولانا مودودی کے نظریاتی بُعد پر صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے گئے حالانکہ اس کا موضوع سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اس لئے کہ یہ تو کسی نے کہا ہی نہیں تھا کہ مولانا کا جنابِ نیاز سے نظریاتی نیاز مندی کا رشتہ ہے۔ بات تو صرف اُن سے اندازِ تحریر اور اسلوبِ انشاء اخذ کرنے اور اس سلسلے میں ان کے زیر تربیت رہنے کی تھی، اور اس پر خود مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے برادرِ بزرگ سید ابوالخیر مودودی کی تحریری شہادتیں موجود ہیں۔

(۳) اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کے اس دور کے نظریاتی فصل وبعد کا ذکر تو کر دیا گیا جبکہ وہ نیشنلسٹ سیاست کے مرد میدان بن گئے تھے لیکن 'الہلال' اور 'حزب اللہ' والے دور کا ذکر گول کر دیا گیا جو مولانا مودودی کے دینی فکر ہی نہیں جذبے کا بھی عظیم ترین ماخذ ومصدر ہے!

(۴) اسی طرح علامہ اقبال کی مدح وستائش کے ضمن میں تو مولانا کی تحریروں کا انسائیکلوپیڈیا مرتب کر دیا گیا..... حالانکہ، قطع نظر اس کے کہ یہ ساری تحریریں قیام پاکستان کے بعد کی ہیں جبکہ بعض جدید مصلحتیں بھی پیدا ہو چکی تھیں، ..... اصل سوال ذاتی تشکّر وامتنان اور حضرتِ علامہ کے انتقال پر تعزیتی شذرے کا تھا جسے غتر بود کر دیا گیا۔

(۵) رہے خیری برادران تو یقیناً اُن کے ضمن میں تو اس ناگوار بحث سے ایک ' خیر' بر آمد ہو ہی گیا کہ کم از کم جماعتِ اسلامی کے حلقے نے پہلی بار مسلمانانِ برّعظیم ہندوپاک کے اس محسن خاندان کا ذکرِ خیر سن لیا!..... لیکن نامعلوم کیوں چھوٹے بھائی ڈاکٹر عبدالستّار خیری کا سن وفات تو درج کر دیا گیا (۱۹۴۵ء) لیکن بڑے بھائی یعنی ڈاکٹر عبدالجبّار خیری کے بارے میں یہ بات واضح نہ کی گئی کہ وہ ۱۹۵۵ء تک بقیدِ حیات تھے' شاید اس لئے کہ اصلاً وہی تھے جن کی قائم کردہ جماعت کے دستور سے مولانا مودودی نے جماعتِ اسلامی کے اولین دستور کی تدوین میں 'رہنمائی' حاصل کی تھی..... حتّٰی کہ ان کے بھتیجے جناب حبیب الوہاب خیری کی روایت کے مطابق ۳۹۔۱۹۳۸ء کے زمانے میں کسی وقت اُن کے ہاتھ پر بیعت بھی کی تھی۔ (خیری صاحب کا کہنا ہے کہ ۱۹۵۷ء میں ایک ملاقات کے موقع پر انہوں نے مولانا مودودی سے اس بیعت کا تذکرہ کیا تو انہوں نے تردید نہیں کی تھی) واضح رہے کہ خیری صاحب راولپنڈی کے سیٹلائٹ ٹاؤن کے بی بلاک میں مقیم ہیں اور وکالت اور سیاست دونوں میدانوں میں سرگرم ہیں! اور راقم نے ان سے بھی درخواست کی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے حالات قدرے تفصیل سے قلمبند فرماویں اس لئے کہ یہ بھی مسلم انڈیا کے اُس دور کی تاریخ کا ایک اہم گوشہ ہے جس سے لوگ جس حد تک بھی آگاہ ہو جائیں اچھا ہے!!..... مزید برآں ڈاکٹر عبدالجبّار خیری کی جماعت کے جس دستور کا ذکر ' ایشیاء' اور ' جسارت' کے فاضل مضمون نگار نے نہایت طنزیہ تحدّی کے ساتھ کیا ہے' بحمداللہ اس کا ایک نسخہ بھی ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مدظلہ' کے پاس موجود ہے!

تاہم راقم اس بحث کو ہرگز بڑھانا نہیں چاہتا اور اس کا مشورہ احبابِ جماعتِ اسلامی کو بھی یہی ہے کہ اصل اہمیت ' شخصیت' کی بجائے نظریئے اور مقصد کو دیں اور توجہات کا اصل مرکز اور اخذ و ردّ اور ترک و قبول کا اصل معیار اشخاص کی بجائے نظریات اور مقاصد کو بنائیں..... اس لئے کہ اگر ذرا ذاتی مفادات اور گروہی مصالح کے ' بلیک ہول' سے نکل کر دیکھا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ وقت کے عظیم دھارے میں سینکڑوں ملّتیں اور اقوام تنکوں کے مانند بہی چلی جا رہی ہیں' پھر ہر ملت و قوم کے بحرِ محیط میں کتنی ہی نظریاتی تحریکوں کی رَوئیں چل رہی ہیں' پھر ہر نظریاتی تحریک کے جلو میں کتنی ہی جماعتیں اور تنظیمیں برسرِ کار ہیں اور

پھر آخری درجے میں ہر جماعت اور تنظیم بہرحال چھوٹے اور بڑے افراد ہی کی محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کی رہینِ منت ہے' ..... اب اگر ایک رُخ سے دیکھا جائے تو یقیناً افراد کی بھی بہت اہمیت ہے اور یہ صد فیصد درست ہے کہ ۔ "افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر۔ ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا!" ..... لیکن اگر دوسرے رخ سے غور کیا جائے تو نظریاتی سطح پر اصل اہمیت ' تحریک ' کی ہوتی ہے تنظیموں اور جماعتوں ' یا افراد اور شخصیات کی نہیں! ..... چنانچہ کسی نظریاتی تحریک کے بحرِ محیط میں شخصیتوں کے بلبلے بھی اٹھتے اور بیٹھتے رہتے ہیں ' اور جماعتی اور تنظیمی ہیئتیں بھی بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں لیکن اصل ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ اس نظریاتی تحریک کے تسلسل کو برقرار رکھا جائے اور اصل توجہ کو اہداف اور مقاصد پر مرتکز کر دیا جائے نہ کہ اشخاص یا افراد پر!

چنانچہ ۲۰ ویں صدی عیسوی کے آغاز میں اسلامیانِ ہند کے بحرِ محیط میں تین تحریکوں کی لہریں اٹھنی شروع ہوئی تھیں جنہوں نے رفتہ رفتہ تین مستقل روؤں کی شکل اختیار کر لی ایک قومی و سیاسی تحریک جس کے جلی اور روشن عنوان کی حیثیت رفتہ رفتہ مسلم لیگ کو حاصل ہو گئی ' دوسری خالص مذہبی اصلاحی تحریک جس کے میدان میں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے اصل ڈنکا تبلیغی جماعت کا بجنے لگا ..... اور تیسرے ' تجدیدی و احیائی تحریک جس کا آغاز تو ہوا تھا ' الہلال ' اور ' حزب اللہ ' سے ' لیکن بعد میں اس کے تسلسل کو قائم رکھا ' ترجمان القرآن ' اور " جماعت اسلامی ' نے ..... جس کے قیام پر اب نصف صدی مکمل ہوا چاہتی ہے' ..... تو کیا فرمان خداوندی "اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ" کے مصداق ابھی وقت نہیں آیا کہ جماعت کے احباب کسی عظیم شخصیت یا جماعتی ہیئت کے بُت کو پوجنے کی بجائے اس اصل تحریک کے افکار و نظریات اور اہداف و مقاصد کے اعتبار سے جائزہ لیں کہ ۔

کون سی وادی میں ہے؟ کون سی منزل میں ہے؟
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں!

پھر جہاں تک شخص مودودی کا تعلق ہے کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جب انہوں نے شعور کی آنکھ کھولی تو برعظیم ہندو پاک کے طول و عرض میں علم و ادب اور فکر و نظر کے میدان میں علامہ

اقبال اور مولانا آزاد کا طوطی بول رہا تھا..... تو اگرچہ ان کے دینی فکر کی تشکیل میں ان دونوں کا نمایاں حصہ ہے، لیکن خالص احیائی و انقلابی انداز چونکہ صرف مولانا آزاد کا تھا لہٰذا وہ سب سے زیادہ متاثر ان ہی سے ہوئے..... البتہ مختلف جہتوں سے اَخذ و کسب اور اس طرح حاصل شدہ مواد کی تالیف و تدوین پر اپنے ذاتی غور و فکر کے اضافے کے ذریعے اُن کی جو سوچ مرتب ہوئی اُسے انہوں نے اس عام فہم اور سادہ و سلیس اندازِ بیان کے ذریعے وسیع پیمانے پر عام کیا جو انہیں اصلاً جناب نیاز فتح پوری کی صحبت و قرب سے حاصل ہوا تھا..... اور جب وہ ۴۰۔ ۱۹۳۹ء میں اپنی اس تحریک کے لئے باضابطہ ہیئتِ تنظیمی کے مسئلے پر غور کر رہے تھے تو اس مرحلے پر انہیں خیری برادران کے قرب و تعلق سے فیض حاصل ہوا جو ایک طویل عرصے تک جرمنی میں قیام کے بعد انہی دنوں واپس آئے تھے اور جنہوں نے وہاں کی مختلف تحریکوں اور تنظیموں، بالخصوص فاشسٹ تحریک کا گہرا مطالعہ کیا تھا!.....

لہٰذا نہ ان کا فکر وحیٔ آسمانی کے مانند ہر غلطی سے مبرّا اور ہر اعتبار سے کامل تھا۔ نہ ان کی اختیار کردہ ہیئت تنظیمی، منصوص، یا حرفِ آخر تھی۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے جو قافلہ تشکیل دیا تھا اسے چھ سات سال تک بڑی ہمّت اور استقامت کے ساتھ، اصولی اسلامی انقلابی، نہج پر چلایا..... البتہ چونکہ وہ عام انسان تھے جو فرمان نبویؐ کے مطابق "مرکبٌ عن الخطاءِ وَالنسیان" ہوتا ہے لہٰذا ان سے غلطیاں بھی ہوئیں جن میں سے بعض تو ہمالیہ جتنی بڑی بھی تھیں..... جن میں سے عظیم ترین غلطی تو یہ تھی کہ تقسیمِ ہند کے موقع پر حالات کی ایک سطحی سی تبدیلی سے دھوکہ کھا کر انہوں نے اپنی مساعی کو "اصولی اسلامی انقلابی تحریک" کی بجائے "اسلام پسند، قومی، سیاسی جماعت" کے رخ پر ڈال دیا..... اور پھر دوسری ہمالیہ ایسی عظیم غلطی ان سے ۵۷۔ ۱۹۵۶ء میں سرزد ہوئی جب ان کے بعض قدیم ترین اور مخلص ترین ساتھیوں نے انہیں اس غلطی کا احساس دلانا چاہا تو انہوں نے ان پر "غیر شعوری سازش" کا الزام لگا کر ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ انہیں مجبوراً ایک ایک کر کے جماعت سے علیٰحدہ ہو جانا پڑا.....

راقم کو یقین ہے کہ مولانا مودودی مرحوم و مغفور کو اپنی ان دونوں غلطیوں کا احساس ہو گیا تھا..... لیکن افسوس کہ یہ اس وقت ہوا جب وہ عمر کی آخری منزل میں تھے اور صحت اور قوّت

جواب دے چکی تھی'..... چنانچہ معاملہ وہی ہوا کہ ع

"جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا!"

کاش کہ جماعت اسلامی کے احباب..... اور بالخصوص ان کے اصحابِ فکر و نظر اور اربابِ حل و عقد مولانا مودودی کی شخصی عظمت کے احساس اور اُن سے ذاتی محبت و عقیدت کے رشتے کے ساتھ ساتھ ان کی خامیوں اور غلطیوں کا ادراک و شعور بھی حاصل کر سکیں..... اور اس اصل تحریک کے "ماضی' حال' اور مستقبل" پر از سرِ نو غور کر سکیں جس کے لئے مولانا مرحوم نے اپنی جُملہ توانائیاں اور صلاحیتیں وقف کر دی تھیں۔

(۳۴)

مولانا مودودی کی پہلی ہمالیہ ایسی غلطی کے بارے میں تو راقم کی مفصل تالیف "تحریک جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ" موجود ہے جو اس نے ۱۹۵۶ء میں رکن جماعت کی حیثیت میں' جماعت کی پالیسی سے اپنے اختلاف کی وضاحت کے لئے اس جائزہ کمیٹی کے سامنے پیش کرنے کے لئے لکھی تھی جسے جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اسی غرض سے نامزد کیا تھا..... البتہ دوسری عظیم غلطی پر تا حال خفاء کا نہایت دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔

راقم الحروف نے ۱۹۶۶ء میں آیۂ مبارکہ "وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا" (اس عورت کے مانند نہ بنو جس نے بڑی محنت سے کاتے ہوئے سوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا: سورۂ نحل آیت نمبر ۹۲) کے حوالے سے 'نقضِ غزل' کے عنوان کے تحت اس تلخ داستان کو قلمبند کرنا شروع کیا تھا جس کی پانچ ہی قسطیں 'میثاق' میں شائع ہوئی تھیں کہ بعض 'بزرگوں' کے حکم سے اسے بند کر دینا پڑا..... وہ دن اور آج کا دن اس داستانِ ظلم کے اصل واقعات ماضی کے دبیز سے دبیز تر ہونے والے پردوں میں مستور ہوتے چلے گئے..... نتیجۃً زیادتی کرنے والا تو فتح کے پھریرے اڑاتا رہا..... اور جن پر زیادتی ہوئی تھی وہ تضحیک اور ملامت کا ہدف بنتے چلے گئے.....!

بہت عرصے کے بعد' پچھلے دنوں جب مشہور صحافی اور دانشور جناب ارشاد احمد حقانی نے' جو خود بھی "یکے از خارجینِ جماعتِ اسلامی" ہی ہیں..... محترم قاضی حسین احمد صاحب کے

امارتِ جماعت کے منصب پر فائز ہونے کے موقع پر روزنامہ "جنگ" میں طویل سلسلۂ مضامین شائع کیا تو اس کی کسی ابتدائی قسط میں اس تلخ داستان کا سرسری سا ذکر بھی آیا..... اس پر روزنامہ "جسارت" کراچی میں کسی غیر معروف شخص نے طنز و تمسخر اور تضحیک و استہزاء کا جو انداز اختیار کیا اس نے ایک جانب تو بہت سے پرانے زخموں کو ہرا کر دیا..... اور دوسری جانب پورا اخلاقی جواز فراہم کر دیا کہ ماضی کی اس امانت کو حال کے حوالے کر دیا جائے۔

ویسے بھی ۵۷۔۱۹۵۶ء کے واقعات پر اب تیس برس سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے اور دنیا کا عام دستور بھی یہی ہے کہ اتنے عرصے کے بعد انتہائی خفیہ دستاویزات بھی شائع کر دی جاتی ہیں۔ (چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف کے وہ اوراق بھی امید ہے کہ اگلے ہی ماہ منظر عام پر آجائیں گے جنہیں اُن کی وصیت کے مطابق سربمہر کر دیا گیا تھا۔) ..... لہٰذا خیال ہو رہا ہے کہ اس داستان کو بھی منظرِ عام پر لے ہی آیا جائے۔ اگرچہ اس کا کوئی قطعی فیصلہ راقم تاحال نہیں کر پایا ہے!

لیکن اگر یہ فیصلہ ہو ہی گیا' تو ظاہر ہے کہ ابتداء ان پانچ اقساط کی دوبارہ اشاعت ہی سے ہو گی جو ۶۷۔۱۹۶۶ء میں 'میثاق' میں شائع ہو گئی تھیں' اور چونکہ وہ راقم کے اس دور کی تحریریں ہیں جن کا تفصیلی ذکر اوپر ہو چکا ہے لہٰذا اُن میں حقائق و واقعات کے ساتھ ساتھ "تیر و نشتر" بھی وافر مقدار میں موجود ہیں جن کے ضمن میں پیشگی معذرت کا کام "اسلام اور پاکستان" کا وہی مقدمہ دے گا جو ۱۹۸۳ء میں ضبطِ تحریر میں آیا تھا اور اوپر من و عن شائع کیا جا چکا ہے!

آخر میں دعا ہے۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل
باطلا وارزقنا اجتنابہ
آمین یارب العالمین!

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

خطابِ جمعہ

ڈاکٹر اسرار احمد

"آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے"

حالاتِ حاضرہ سے متعلق بعض مسائل پر امیر تنظیم اسلامی کا خطاب

مرتب: حافظ خالد محمود خضر

حضرات! یہ غالباً پہلی مرتبہ ہو رہا ہے کہ میں ملکی حالات کے ضمن میں تین اہم موضوعات پر اس اجتماعِ جمعہ سے باضابطہ اعلان کے ساتھ خطاب کر رہا ہوں میں تقریباً تینتیس (۳۳) دن ملک سے باہر رہا ہوں اور اس دوران یہ تین اہم چیزیں سامنے آئی ہیں: نمبر (۱) بلدیاتی انتخابات نمبر (۲) ایک بڑی تلخ اور تکلیف دہ بحث جو سردار عبدالقیوم خان صاحب کی اس تقریر کی بنیاد پر پیدا ہوئی ہے جو انہوں نے ناروے میں کی تھی اور نمبر (۳) ایک خاص بونڈز جن کا اجراء واپڈا کی طرف سے ہوا ہے یہ تینوں مسائل ایسے ہیں جن کا میرے نظریات اور میرے فکر سے بھی گہرا تعلق ہے اور ان تینوں ہی کے بعض پہلو ایسے بھی ہیں جن کے ساتھ میرا جذباتی وابستگی کا معاملہ بھی ہے' اس اعتبار سے یقیناً اندیشہ ہے کہ میں توازن قائم نہ رکھ سکوں اور اعتدال کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے اسی لئے میں جو دعائیں عام طور پر ہر خطاب سے قبل عادتاً کیا کرتا ہوں وہ آج خاص طور پر شعوری اور ارادی طور پر کی ہیں یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ ایک طرف میری زبان کی گرہ کو کھول دے اور مجھے بات کو ایسے انداز میں کہنے کی توفیق عطا فرمائے جسے آپ حضرات صحیح طور سے سمجھ سکیں اور دوسری طرف پروردگار ہم سب کو بالعموم اور مجھے بالخصوص اپنی حفاظت اور امان میں رکھے اور شیطانِ لعین اور نفسِ امّارہ کے شر سے اپنی پناہ میں رکھے اور ہمیں سچ کو سچ ہی کی حیثیت سے دکھائے اور اس کے اتباع کی توفیق اور اعتراف و اعلان کی جرأت عطا فرمائے اور باطل کو باطل ہی دکھائے اور ہمیں توفیق دے کہ اس سے اپنے دامن کو بچا سکیں' آمین۔

سب سے پہلا مسئلہ جو یقیناً قومی سطح پر کافی اہمیت کا حامل ہے اور اس کے ہماری ملکی سیاست پر کافی دور رس اثرات پڑ سکتے ہیں وہ اس ملک میں ہونے والے حالیہ بلدیاتی انتخابات کا ہے۔ ایک طرف تو یہ کہ ان انتخابات کا انعقاد اپنی جگہ پر ایک خوش آئند معاملہ ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ

مطلق مارشل لاء سے ہم رفتہ رفتہ جمہوریت کی طرف اور ایک نمائندہ حکومت کی طرف تدریجاً پیش قدمی کر رہے ہیں اور اس کے ضمن میں یہ بھی ایک اچھا قدم ہے جو اٹھا ہے..... اور اس ضمن میں میں نے بالکل شروع میں جو بات کہی تھی وہ آپ کو یاد ہو گی کہ اگرچہ مجھے ان ترامیم سے شدید اختلاف تھا جو صدر ضیاء الحق صاحب نے اپنے "اختیارِ خصوصی" کے حوالے سے ۱۹۷۳ء کے دستور میں کر دی تھیں لیکن اس کے باوجود میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے تحت بھی اگر انتخابات ہو گئے ہیں اگرچہ غیر جماعتی ہوئے ہیں تب بھی بہرحال یہ اس ملک میں جمہوریت کی طرف بتدریج رجوع کے ضمن میں ایک اچھا قدم ہے اور اس سے یقیناً بہتری کی توقع ہے۔ اور اس کے بعد بھی میں نے اس کا مسلسل اظہار کیا ہے بلکہ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے تو نویں ترمیم کے بل کو بھی خوش آمدید کہا تھا..... کہ بہرحال کسی نہ کسی درجے میں دین اور شریعت کی طرف ایک قدم اس کے ذریعے بھی اٹھ سکتا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ کہیں راستے ہی میں اٹک گیا ہے اور اس کے متبادل جو شریعت بل پیش کیا گیا تھا وہ بھی ابھی کسی سرد خانے کے اندر پڑا ہوا ہے اور اس کے منظور ہونے کا بھی بظاہر احوال کہیں کوئی امکان نظر نہیں آ رہا۔ بہرحال میرے نزدیک یہ الیکشن کا انعقاد ایک بہت خوش آئند بات ہے۔

موجودہ سیاسی فضا اور اسکا تقاضا

انتخابات کے بعد اس وقت ملک میں جو فضا بن گئی ہے وہ بھی قابل توجہ ہے۔ مسلم لیگ کے نام سے جو سرکاری پارٹی قائم کی گئی تھی اس کے بارے میں میں نہیں چاہتا کہ آپ کا وقت ضائع کروں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ وہ عوام میں سے نہیں ابھری بلکہ برگد کے درخت کی ہوائی جڑوں (Adventitious Roots) کی طرح اوپر سے اتری ہے۔ لیکن بہرحال اس وقت ہمارے معاشرے کے جو بھی اجزائے ترکیبی ہیں اور جو بھی Politico-Socio Economic Structure یعنی سیاسی و معاشی ڈھانچہ اس وقت ملک میں قائم ہے..... اس کے اعتبار سے جو بات ہونی چاہئے تھی وہی ہوئی ہے کہ لوگ اس کے گرد جمع ہوئے ہیں' اس وقت اس کے کیمپ میں چہل پہل ہے' رونق ہے۔ یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ اس جماعت نے بھی خواہ اپنی ہیئت ترکیبی اور اپنے نقطۂ آغاز کے اعتبار سے اس کی حیثیت کچھ بھی ہو' یہ محسوس کر لیا ہے کہ جب تک وہ عوامی بہبود کے کوئی کام نہیں کرے گی اب اس ملک میں اس کا آگے چلنا یا برقرار رہنا ممکن نہ ہو گا۔ اور ہم واقعتاً

محسوس کرتے ہیں کہ بعض میدانوں میں ان کی طرف سے عوامی بہبود کے لئے بھاگ دوڑ اور محنت و کوشش ہو رہی ہے۔ اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ بالآخر زود یا بدیر الیکشن جماعتی بنیاد پر ہوں گے اور پھر یہی عوام کے ووٹ فیصلہ کن ہو جائیں گے۔ لہٰذا اس کے لئے اس جماعت کی طرف سے بھی عوام کے دلوں کو جیتنے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کی بڑی ہی پختہ کوششیں ہو رہی ہیں۔ میرے نزدیک یہ بھی ایک خوش آئند بات ہے اور اس سے اس ملک کے مستقبل کے بارے میں ایک اچھی امید کی صورت سامنے آتی ہے۔

اس فضاء میں یہ بھی سوچا جا رہا ہے کہ عام انتخابات جلد از جلد کرا دیئے جائیں تاکہ اس وقت جو فضا پیدا ہوئی ہے اس سے سرکاری پارٹی کو اس وقت جو بڑی نمایاں کامیابی بعض علاقوں میں حاصل ہوئی ہے اندرون سندھ میں بھی اور خاص طور سے پنجاب میں تو اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لئے عام انتخابات بھی جلد از جلد کرا دیئے جائیں ظاہر بات ہے کہ ایم۔ آر۔ ڈی میں جو جماعتیں شامل ہیں ان کا تو شروع سے ہی یہ مطالبہ ہے کہ فوری طور پر عام انتخابات کا جماعتی بنیاد پر انعقاد ہونا چاہئے اب بعض دوسری جماعتوں نے بھی اس کا مطالبہ کیا ہے۔ آپ کے علم میں ہے کہ اب جماعت اسلامی کا موقف بھی یہی ہے' چاہے وہ اس کے لئے کوئی تحریک چلانے پر آمادہ نہ ہو کہ اب جماعتی بنیاد پر مڈٹرم (Mid - Term) الیکشن ہو جانے چاہئیں اور ان کی طرف سے ۱۹۸۸ء کے بارے میں خاص طور پر یہ بات آئی ہے کہ یہ سال انتخابات کا سال ہونا چاہئے۔ میری ذاتی رائے بھی یہی ہے کہ اب اس میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ عام انتخابات جس قدر جلد ہو جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔ اس لئے کہ ایک تو تصویر کا مثبت رخ ہے جو میں نے آپ کے سامنے رکھا ہے لیکن تصویر کا ایک منفی رخ بھی ہے کہ ان غیر جماعتی انتخابات سے کوئی قومی سوچ رکھنے والے عناصر کو تقویت حاصل نہیں ہوئی اس ضمن میں کراچی اور حیدر آباد کی مثال بہت نمایاں ہے۔ ویسے تو یہ معاملہ کم و بیش ہر جگہ موجود ہے کہ نمائندوں کا چناؤ قومی سوچ' کل پاکستان فکر اور سوچ کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ اس میں زیادہ تر ذاتی منفعتیں' ذاتی مصلحتیں اور اقتدار طلبی کو پیش نظر رکھا جاتا ہے' یا پھر برادریوں اور لوکل چودھراہٹوں کی کشمکش ہوا کرتی ہے اور یا پھر جیسا کہ سندھ اور کراچی میں ہوا ہے یعنی لسانی اور گروہی عصبیت کی بنیاد پر لوگوں نے بہت نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ یقیناً یہ ایک تخریبی عمل ہے۔ جو ملک کے مستقبل کے لیے خوش

پاکستان فکر اور سوچ کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ اس میں زیادہ تر ذاتی منفعتیں ' ذاتی مصلحتیں اور اقتدار طلبی کو پیش نظر رکھا جاتا ہے ' یا پھر برادریوں اور لوکل چودھراہٹوں کی کشمکش ہوا کرتی ہے اور یا پھر جیسا کہ سندھ اور کراچی میں ہوا ہے یعنی لسانی اور گروہی عصبیت کی بنیاد پر لوگوں نے بہت نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ یقیناً یہ ایک تخریبی عمل ہے۔ جو ملک کے مستقبل کے لئے خوش آئند نہیں ہے اور جماعتی بنیاد پر عام انتخابات کے انعقاد میں جتنی دیر لگے گی اتنا ہی اس عمل کو تقویت حاصل ہوگی اور اس کی جڑیں اور گہری ہوں گی۔ لہٰذا اس میں حتی الامکان تاخیر نہیں ہونی چاہئے اور جلد از جلد جماعتی بنیادوں پر عام ملکی انتخابات کا انعقاد عمل میں آجانا چاہئے۔

ان انتخابات کے ضمن میں ایک تیسری بات جو میں عرض کرنا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ جہاں جو لوگ منتخب ہو کر آئے ہیں انہیں بھرپور موقع ملنا چاہئے کہ وہ کام کریں اور اس میں کسی بھی بالاتر سرکاری مشینری کو نہ صوبائی حکومت کی سطح پر اور نہ مرکزی حکومت کی سطح پر کوئی دخل اندازی کرنی چاہئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جمہوری روایات کے پروان نہ چڑھنے میں ایک بہت بڑا عمل دخل ان چیزوں کا ہے کہ اگر کسی کے نزدیک کوئی غیر پسندیدہ عنصر کہیں پر کامیاب ہو جاتا ہے تو ہر ممکن طور پر کوشش کی جاتی ہے کہ اس کا راستہ روکا جائے اور اسے کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ یہ معاملہ خاص طور پر اگر کراچی اور حیدر آباد میں ہوا تو وہ بڑے خوفناک نتائج کا حامل ہو گا۔ ہمارے سامنے ہندوستان کی تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ وہاں بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ باضابطہ کمیونسٹ پارٹیز' مارکسسٹ پارٹیز نے الیکشن جیت لئے لیکن..... کبھی یہ نہیں ہوا کہ انہیں اقتدار میں آکر کام کرنے کا موقع دینے میں کوئی بخل سے کام لیا گیا ہو۔ "کیرالہ" میں تو کمیونسٹ حکومت بن گئی تھی۔ ہوتا یہی ہے کہ اس قسم کے لوگ نعروں کے بل پر اقتدار میں آجاتے ہیں لیکن پھر جب کام کرنے کا موقع آتا ہے تو بات کھلتی ہے کہ کس میں کتنی صلاحیت ہے یا نہیں ہے اور پھر یہ جو حالات معروضی طور پر موجود ہیں ان میں کتنا کام فی الواقع کیا جا سکتا ہے۔ اور جب کسی جگہ پر بیٹھ کر بالفعل کام کرنے کا موقع آتا ہے تو اکثر و بیشتر یہی ہوتا ہے کہ جذباتی ہنگامہ آرائی سے یا نعروں کے ذریعے سے آنے والے لوگ خود ناکام ہو جاتے ہیں اور ان کی حقیقت خود ان کے اپنے لوگوں کے سامنے کھل جاتی ہے جنہوں نے انہیں ووٹ دے کر کامیاب کیا ہوتا ہے اور اگر اس کے برعکس روش اختیار کی جائے یعنی انہیں دبایا جائے یا کسی سازشی انداز میں ان کا راستہ روکا جائے تو انہیں ہمدردیاں حاصل ہوتی ہیں۔ پھر اس صورت حال کے جو وسیع تر سطح پر دوررس

نتائج نکلتے ہیں وہ ملک و قوم کے لئے بڑے خوفناک ہوتے ہیں۔ تو ہمیں اس چیز کو سامنے رکھنا چاہئے کہ وہ لوگ کام کریں، آئیں محنت کریں اور درپیش مسائل کو حل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں۔ اگر وہ کچھ کام کریں گے تو ظاہر بات ہے کہ اس کا فائدہ ملک و قوم کو ہو گا۔

کیا انتخابات کے ذریعے اسلامی نظام کا نفاذ ممکن ہے؟

انتخابات کے بارے میں میرا موقف بارہا آپ کے سامنے آیا ہو گا جو عام طور پر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا، لیکن ذرا سا انہیں ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقع مل جائے اور بات ان کے سامنے وضاحت کے ساتھ رکھی جائے تو وہ بالکل دو اور دو چار کی طرح صاف بھی ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہ ایک طرف میرا موقف یہ ہے کہ اس ملک میں اسلام الیکشن کے راستے سے نہیں آ سکتا۔ اس اعتبار سے ہم نے یہ طے کیا ہوا ہے کہ کبھی الیکشن کے میدان کا رخ ہی نہیں کرنا ہے۔ ہماری تنظیم اسلامی کبھی یہ راستہ اختیار نہیں کرے گی۔ دوسری طرف میں انتخابات کے انعقاد کا بھی انتہائی موید ہوں۔ بہت زور کے ساتھ اس بات کا قائل ہوں اور اس کا اعلان کرتا رہا ہوں کہ الیکشن ہوتے رہنے چاہئیں۔ جمہوری فضاء برقرار رہنی چاہئے تو بظاہر اس میں لوگوں کو تضاد نظر آتا ہے حالانکہ کوئی تضاد نہیں ہے۔ ایک سادہ سی مثال سے میں سمجھایا کرتا ہوں کہ دیکھئے دو چیزیں بالکل مختلف ہیں۔ اور ان کے تقاضے بھی یکسر مختلف ہیں۔ ایک مثال سامنے رکھئے کہ ایک ہے کسی شخص کا مسلمان بننا، اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ ایک ہے اس کا زندہ رہنا، اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ زندہ رہنے کے لئے ہر انسان کو غذا، پانی اور ہوا چاہئے۔ ان تینوں میں سے کوئی چیز ختم ہو جائے گی یا منقطع کر دی جائے گی۔ جلد یا بدیر اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ اس عالم مادی میں زندگی سلسلۂ اسباب سے قائم ہے۔ تو یہ تینوں چیزیں اس کے لئے ناگزیر ہیں۔ اس میں کسی مسلم، ہندو، سکھ، پارسی کی کوئی تمیز اور تفریق نہیں ہے۔ لیکن کسی شخص کو مسلمان بننے کے لئے ایمان کی ضرورت ہے۔ کوئی رتی، ماشہ، تولہ ایمان یہاں ہو گا تو اسی درجے سے اس کے اندر اسلام پیدا ہو گا اور وہ اسلام پر عمل کر سکے گا۔ تو یہ دونوں چیزیں اور ان کے تقاضے مختلف ہیں اور ان میں گڈمڈ نہیں کرنا چاہئے۔

پاکستان جیسے ملک میں جو تمدنی اعتبار سے از منۂ قدیمہ کے اندر نہیں بلکہ دورِ جدید کے ساتھ ہے اس بات کی واقعۃً ضرورت ہے کہ ایک ایسی فضا باقی رہے جس میں لوگوں کو اطمینان ہو کہ ہماری

رائے کو اہمیت حاصل ہے اور ہم پر کوئی اور حکومت نہیں کر رہا ہے۔ اگر کہیں کسی صوبے پر کسی دوسرے صوبے کی حکومت، کسی طبقے پر کسی دوسرے طبقے کی حکومت یا کسی قومیت پر کسی دوسری قومیت کے دباؤ کا احساس ہو تو اس سے بڑے منفی اور بڑے تخریبی جذبات پیدا ہوتے ہیں جس کے نتائج بڑے خوفناک نکلتے ہیں۔ چنانچہ یہ احساس برقرار رہنا چاہئے کہ ہمارا معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ تبدیلیٔ حکومت کا عمل (Process) ایسا ہو جس پر اعتماد ہو کہ یہاں تبدیلی ووٹ سے آتی ہے اور حکومت اور اس کی پالیسیوں کے تبدیل ہونے کا دار و مدار لوگوں کی رائے پر ہے۔ اس فضا کا برقرار رہنا اس ملک کے لئے بہت ضروری ہے جو اب ان ملکوں میں شامل ہے جو اس سطح سے مختلف ہو چکے ہیں جہاں بادشاہت یا قبائلی نظام چل رہا ہو یا چل سکتا ہو۔ یہاں میں لفظِ جمہوری جان بوجھ کر استعمال نہیں کرنا چاہتا اس لئے کہ اس کے پھر بہت سے مفہوم ہیں لیکن بہرحال آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان عوامی دور میں داخل ہو چکا ہے۔ اس عمل میں جتنی بھی رکاوٹیں ڈالی گئی ہیں وہ درحقیقت اس ملک کے لئے بہت تباہ کن ثابت ہوئی ہیں اور اسی کے نتیجے میں ملک دولخت بھی ہوا ہے۔ اور یہ خطرات آئندہ بھی ہیں۔ چنانچہ یہاں انتخابات ہوتے رہنے چاہئیں۔ اور عوام کو یہ محسوس ہونا چاہئے کہ ہمارا معاملا ہمارے ہاتھ میں ہے۔

جہاں تک اسلام کے نفاذ کا تعلق ہے اس کا اس انتخابی عمل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے لئے تو آپ کو عوام کے اندر اور بالخصوص ملک کے پڑھے لکھے، باشعور اور سمجھ دار طبقے (Intelligentsia) میں اس ایمانی کیفیت اور جذبات کو پیدا کرنا ہو گا اور اس احساس کو تقویت دینی ہو گی کہ اجتماعی سطح پر ایک اجتماعی ارادہ (Collective Will) ہمارے معاشرے کے اندر ظہور میں آئے کہ ہمیں مسلمان رہنا ہے، مسلمان جینا ہے اور مسلمان مرنا ہے۔ جب تک یہ نہیں ہو گا اس وقت تک اسلام نہیں آسکتا۔ پھر یہ کہ اس کے بعد بھی اسلام لانے کا طریقہ کیا ہو گا؟ تو اس کے لئے ایک انقلابی منہج ہی موثر ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ انتخابات میں تو فیصلہ ووٹوں کی گنتی پر ہوتا ہے۔ ہر شخص کا ایک ووٹ ہے۔ بڑے سے بڑے صاحبِ یقین کا بھی ایک ووٹ ہے اور جو ایمان کی دولت سے تہیٔ محض ہو اس کا بھی ایک ووٹ ہے، فاسق و فاجر کا بھی ایک ووٹ ہے اور متقی اور زاہد کا بھی ایک ووٹ ہے۔ بڑے سے بڑے حکیم اور فلسفی اور عالم کا بھی ایک ووٹ ہے۔ حتیٰ کہ اگر علامہ اقبال بھی زندہ ہوتے تو ان کا بھی ایک ہی ووٹ ہوتا اور ایک بالکل

جاہل جس کو نہ ملکی حالات کا کچھ پتہ ہے اور نہ ہی اسے کسی بھی مسئلے کی کوئی سمجھ اور فہم ہے اس کا بھی ایک ووٹ ہے چنانچہ اسلام کا نفاذ کبھی بھی ووٹ کے ذریعے سے نہیں ہو سکے گا بلکہ اس کے لئے ہمیں انقلابی طریق اختیار کرنا ہو گا جس میں ایک اقلیت اپنے جذبے اور نظریاتی وابستگی کی بنیاد پر مؤثر (Effective) اور فیصلہ کن ہو جاتی ہے۔ اس عمل کے ذریعے سے وہ حق پر ڈٹ جاتی ہے اور پھر انقلاب آتا ہے۔ یہ ایک تفصیلی بحث ہے۔ اس موضوع پر میری پوری کتاب " منہج انقلابِ نبویؐ " کے نام سے منظر عام پر آچکی ہے۔

کراچی اور حیدر آباد کے نئے سیاسی حالات

اس ضمن میں کراچی اور حیدر آباد کے تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات سے ہماری آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ یہ علاقہ دینی قوتوں خاص طور پر جماعت اسلامی کا ایک بہت بڑا سیاسی گڑھ تھا۔ اور یہ عجیب صورت حال ہے کہ یا تو بالکل انتہائی جنوب میں ان کی ایک مستحکم سیاسی حیثیت تھی یعنی کراچی وغیرہ میں یا پھر بالکل شمال میں سوات اور دیر کے علاقہ میں سیاسی سطح پر جماعت اسلامی کی مضبوط حیثیت تھی۔ ان میں سے اب صرف شمال میں ان کی حیثیت مستحکم ہے۔ ان انتخابات نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس ملک میں ان کی جو بھی سیاسی بنیاد تھی وہ اب رفتہ رفتہ منہدم ہو رہی ہے۔ اس اعتبار سے کراچی کا مسئلہ خاص طور پر ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ قوموں اور تحریکوں کی زندگی میں جو اس قسم کے مواقع آتے ہیں وہ بہت قیمتی ہوتے ہیں اور موقع فراہم کرتے ہیں کہ از سرِ نو معاملات پر غور کیا جائے کہ یہ ہوا کیا ہے؟ ایک انقلابی اور نظریاتی تحریک کے اثرات کبھی بھی اتنی تیزی سے ختم نہیں ہو جاتے۔ معلوم ہوا کہ مسئلہ کچھ اور ہے یہاں انقلابی اور نظریاتی بنیاد پر نہیں بلکہ کچھ رفاہی کاموں اور کچھ سیاسی نعروں کی بنیاد پر وہ سارا Base فراہم کیا گیا تھا جو اس تیزی کے ساتھ 'Wash out' ہو گیا ہے ورنہ وہ اگر انقلابی بنیادوں پر ہوتا یا نظریاتی بنیادوں پر بھی ہوتا تو اس کے اندر اتنی تیزی کے ساتھ تبدیلی نہیں آ سکتی تھی جس تیزی کے ساتھ اور جتنے نمایاں پیمانہ پر تبدیلی وہاں آئی ہے۔ اس پہلو سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس ملک کے اندر دین کے مستقبل کے بارے میں خلوص اور اخلاص کے ساتھ غور و فکر کرنے والے عناصر اور اس کے لئے کام کرنے والی جماعتوں اور تحریکوں کے لئے یہ ایک اہم لمحۂ فکریہ ہے۔ وہ ذرا خود احتسابی (Self Assessment) کے انداز میں اپنے حالات کا جائزہ لیں۔ اور سوچیں کہ کہیں ہم

سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی ہے پھر اس غلطی کے ازالے کے لئے از سرِ نو کوشش کریں۔

جماعت اسلامی کے لئے دو متبادل راستے

کراچی اور حیدر آباد کا جو معاملہ ہوا ہے اس کے پیش نظر میرے نزدیک جماعت کے لئے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ تو سیاسی ہے اور اس کے لئے دلائل دیئے جا سکتے ہیں' جیسے کہ اب تک دیئے جاتے رہتے ہیں۔ کہ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی لکھا ہوا ہے کہ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ چنانچہ یہ اونچ نیچ تو ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح کے دلائل قرآن مجید میں ان لوگوں کے بھی نقل ہوئے ہیں جن پر عذاب آتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کیا ہے اس میں؟ آتے ہی رہتے ہیں عذاب..... " قَدْ مَسَّ اٰبَائَنَا الضَّرَّاءُ وَالسَّرَّاءُ یعنی ہمارے آباؤ اجداد پر بھی کبھی اسی طرح فراخی کے دن آئے تھے' کبھی تنگی کے دن آجاتے تھے' کبھی خوشی کے مواقع آجاتے تھے کبھی غمی کے مواقع آتے تھے۔ ان کا اس سے کیا تعلق ہے کوئی اللہ کی حکمت ہے' اللہ کی طرف سے کوئی تنبیہ ہے یا اس میں ہمارے لئے عذاب کا کوئی پہلو ہے۔ تو یہ چیزیں ہمیشہ سے تھیں۔ اسی طرح اب بھی موقع ہے کہ کہا جائے کہ کوئی بات نہیں۔ ٹھیک ہے۔ سیاسی جنگ ہے۔ اب یہ لوگ آئے ہیں' کام کریں' محنت کریں' کچھ کر کے دکھائیں' ان کے غبارے سے خود بخود ہوا نکل جائے گی' لوگ از خود سوچیں گے اور اگلے الیکشن میں انہیں اپنی رائے تبدیل کرنا پڑے گی۔ ہم از سرِ نو ہمت کر کے' کمر کس کے میدان میں آئیں گے ع

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

کوئی بنیادی تبدیلی لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اندیشہ یہی ہے کہ سوچ یہی ہو گی۔ لیکن اگر وہ اس مسئلہ پر غور کریں اور کچھ سوچ بچار سے کام لیں تو یہ ایک بہت ہی سنہری موقع ہے' جیسا سنہری موقع ۱۹۷۰ء میں آیا تھا۔ اور میری ذاتی اطلاع یہی ہے اور اس کے شواہد موجود ہیں کہ کم سے کم مولانا مودودی مرحوم اس مرحلے پر اس فیصلے تک پہنچ گئے تھے کہ الیکشن کے ذریعے سے یہاں اسلام نہیں آسکتا۔ لہٰذا ہمیں کوئی متبادل سوچ اور کوئی متبادل راستہ اختیار کرنا ہو گا۔ لیکن چونکہ وہ علیل تھے' ضعیف تھے' بڑھاپے کی اس سرحد کو پہنچ چکے تھے کہ وہ خود اپنے اس نقطۂ نظر کو پوری قوت کے ساتھ Assert نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس سلسلے میں عملاً کوئی اقدام نہیں کیا۔ لیکن ان کی رائے ۷۰ء کے الیکشن کے بعد یہی تھی۔ اب جماعت کے لئے پھر ایک موقع ہے

اور میں پورے خلوص واخلاص کے ساتھ ان سے یہ عرض کروں گا کہ وہ جائزہ لیں اور اپنی حکمتِ عملی پر نظرِ ثانی کریں۔ ایک بڑا کھلا راستہ ہے کہ وہ انتخابی میدان سے قدم پیچھے ہٹالیں اور باعزت پسپائی اختیار کرلیں۔ اور ایک پریشر گروپ کی حیثیت سے صرف اسلام کے لئے اس انداز سے کام کریں کہ ہمیں سیٹیں نہیں چاہئیں، ہمیں اسلام چاہئے، ہمیں کوئی ووٹ نہیں چاہئے، ہم عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ یہاں پر یہ چیزیں اس ملک کے بنیادی نظریہ یعنی اسلام کے منافی ہیں۔ ہم اسلام کے لئے قائم ہونے والے ملک میں یہ سب کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ یہ دباؤ وہ ہوگا کہ جو بہت فیصلہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔

جب جماعت سیٹوں کی کشمکش اور انتخابی تصادم سے بالاتر ہوجائے گی تو مختلف جماعتوں کے اندر جو مخلص عناصر کام کر رہے ہیں انہیں بھی موقع ملے گا کہ وہ سب لوگ سوچیں اور غور کریں۔ اس طرح انہیں بہت بڑی حمایت اس ملک کے اندر حاصل ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ مختلف کیمپوں میں اسلام کے حق میں جو منتشر قوت ہے وہ متحد ہوسکے اور اس پلیٹ فارم پر ایک مشترکہ جدوجہد کی جاسکے۔ ظاہر بات ہے کہ جب الیکشن کا معاملہ ہوتا ہے تو ایسے تمام عناصر ایک دوسرے کے مدِمقابل ہوجاتے ہیں اور ان کے مابین اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی ہے..... اور پھر جب الیکشن لڑنا ہی ہے تو جب الیکشن نہیں ہو رہے ہوتے تب بھی اعصاب کے اوپر وہی مسلط ہوتے ہیں۔ ساری پالیسیاں، سارا غور وفکر، ساری گفت وشنید اسی رنگ میں ہوتی ہے اور نگاہ لگی رہتی ہے کہ اس سال ہوسکتا ہے الیکشن ہوجائیں۔ اس سال نہ ہوں تو شاید اگلے سال ہوجائیں۔ ورنہ ۱۹۹۰ء میں تو بہرحال حکومت کہتی ہی ہے کہ ہوں گے۔ اگرچہ پیرپگاڑا صاحب تو کہتے ہی رہتے ہیں کہ ۹۲ء میں یا ۲۰۰۲ء میں۔ واللہ اعلم!..... تو جب تک ایک شعوری، حتمی اور واضح فیصلہ نہیں ہوتا اس وقت تک ہمیں کچھ بنیادی کام بھی کرنا چاہئے، ذرا یہ بھی کرلینا چاہئے۔ لیکن رہے معاملہ وہیں کا وہیں تو اس طرح کی کوئی بھی نیم دلانہ کوشش صورت حال میں کوئی محسوس اور نتیجہ خیز تبدیلی نہیں لاسکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک دفعہ جی کڑا کر کے یہ کڑوی گولی نگل لی جائے اور اعتراف کرلیا جائے کہ ہم سے خطاء ہوئی ہے ہم نے اس معاشرے سے یہ غلط توقع وابستہ کر رکھی تھی کہ اسلام سے اس کی وابستگی بڑی فیصلہ کن ہے لیکن ہمیں اس نے مایوس کیا ہے۔ بہرحال ہم نے اتنا عرصہ اس میں کام کر کے اور حصہ لے کر دکھادیا ہے۔ اب اگر معاملہ اس رخ سے نہیں ہوتا ہے تو ہمیں تو اسلام کے لئے جینا اور مرنا ہے اور اس کے لئے جو بھی دوسرا

متبادل راستہ سامنے آتا ہے اس کے لئے ہمیں محنت کرنی ہے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ کچھ حضرات کو شاید یہ بات بری لگے گی لیکن میں پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ دعوت دیتا ہوں اور چونکہ ظاہر بات ہے کہ میرا ایک ماضی کا تعلق جماعتِ اسلامی کے ساتھ ہے تو اگرچہ میں دین کے مستقبل کے ساتھ ایک گہری قلبی، جذباتی، ذہنی اور فکری وابستگی رکھنے والے تمام عناصر سے مخاطب ہوں لیکن اس میں میرا روئے سخن سب سے بڑھ کر جماعت اسلامی کی طرف ہے کہ اسے اس صورت حال سے سبق حاصل کرنا چاہئے اور اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ اس وقت کو مضبوطی کے ساتھ تھامنا چاہئے اور اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہمت دے اور توفیق دے تو ایک بار جرأتِ رندانہ سے کام لیتے ہوئے واضح اعلان کرنا چاہئے کہ ہم اس میدان کے کھلاڑی نہیں ہیں، ہم یہاں کے مقابل نہیں ہیں لڑے جسے لڑنا ہو برادری کی بنیاد پر، پیسے کی بنیاد پر یا کسی اور بنیاد پر ہم تو عام آدمی سے بھی کہتے ہیں کہ وہ اسلام پر کاربند ہو اور جو بھی یہاں برسرِ اقتدار آجائے گا اس سے بھی مطالبہ ہوگا کہ یہاں اسلام کو نافذ کریں، اسلام کو قائم کریں اور اسی کے حوالے سے ایک انقلابی جدوجہد اتنی 'Broad Based' ہو سکتی ہے کہ پھر وہ فیصلہ کن ہو جائے اور کسی مرحلے پر جا کر کوئی اقدام کا عمل بھی کیا جا سکے، منکرات کو چیلنج کیا جا سکے اور پھر کوئی تبدیلی عملاً اعلیٰ ترین سطح پر اس ملک میں ہو جائے۔ لیکن اس کے بغیر جو کچھ ہو رہا ہے یا اب تک ہوتا رہا ہے اگر اسی نہج پر آگے بڑھنے کی کوشش کی گئی تو کوئی بہتر نتیجہ نکلنے کی امید نہیں ہے۔

سردار عبدالقیوم اور جسٹس جاوید اقبال کا مناقشہ

دوسرا مسئلہ جس کے بارے میں مجھے اظہار خیال کرنا ہے وہ سردار عبدالقیوم خان صاحب کی "ناروے" کی تقریر اور اس پر خاص طور سے لاہور میں شدید ردعمل ہے۔ سردار صاحب کی یہ تقریر ۱۴۔ اگست کے آس پاس کی ہے جب یوم پاکستان کی تقریبات میں شرکت کے لئے سردار صاحب بھی اور جسٹس جاوید اقبال صاحب بھی وہاں گئے ہوئے تھے۔ اور وہاں دو ایک تقریبات میں ان کا یکجا خطاب بھی ہوا۔ انہی تقریروں میں جو باتیں سامنے آئی ہیں ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے جو اس وقت ملک میں کافی جذباتی مسئلہ بن گیا ہے اور اس کے ضمن میں ہر شخص سوچ رہا

ہے۔ اور میں جب بیرون ملک سے واپس آیا تو آتے ہی یہ مسئلہ میرے سامنے آیا تو میں بھی پریشان ہوا' اس لئے کہ م ۔ ش صاحب کی جو دوسری ڈائری تھی بڑی مختصر سی وہ میں نے پڑھی لیکن اس سے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ میری وطن واپسی سے قبل ان کی ایک تفصیلی ڈائری بھی آ گئی تھی وہ میں نے بعد میں ڈھونڈ کر تلاش کی اور اس کو پڑھا۔ پھر یہ بہت اچھا ہوا کہ "نوائے وقت" نے ان تقاریر کے متن بھی شائع کر دیئے تاکہ پورے کا پورا معاملہ سامنے رہے۔ اگرچہ سردار صاحب کا یہ کہنا ہے کہ اس میں کوئی کمی بیشی کی گئی ہے۔ اور جو فلم ادارہ نوائے وقت کے زیر اہتمام دکھائی گئی ہے اس میں بھی کوئی تبدیلیاں کی گئی ہیں یہ سردار صاحب کی طرف سے بڑا تشویشناک الزام (Serious Charge) ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ تو کسی عدالتی کارروائی کے نتیجے میں ہی معلوم ہو سکتا ہے کہ کیا واقعی ان ویڈیوز میں کوئی دخل اندازی کی گئی ہے یا نہیں اس کا امکان تو موجود ہے لیکن فی الواقع ایسا ہوا ہے یا نہیں' اس کا فیصلہ نہ آپ کر سکتے ہیں نہ میں کر سکتا ہوں۔

جذباتیت سے گریز ضروری ہے

خود سردار صاحب کی طرف سے اپنی اور جسٹس جاوید اقبال صاحب کی تقاریر کا جو متن شائع ہوا ہے اور جو چیزیں "ادارہ نوائے وقت" کی طرف سے سامنے آئی ہیں اور پھر سردار عبدالقیوم صاحب کی طرف سے مزید وضاحتیں سامنے آئی ہیں ان میں جو چیزیں قدرِ مشترک ہیں' ظاہر ہے کہ وہ کسی بھی اختلاف سے بالاتر ہیں اور ان میں کسی بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے چنانچہ اس پورے مسئلے کو دیکھ کر میری جو بھی رائے بنی ہے وہ میں آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں۔ اس میں میں پھر اللہ تعالیٰ سے پناہ کا طالب ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس میں میری جذباتی وابستگی کو اثر انداز نہ ہونے دے اور میں صحیح صحیح بات کہہ سکوں جیسے کہ میں نے آج خطاب کے آغاز میں بھی خصوصی طور پر دعائیں کی ہیں۔ علاوہ ازیں سورۃ النساء میں بھی فرمایا گیا کہ "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ" یعنی اے اہلِ ایمان! عدل اور انصاف کو قوت کے ساتھ لے کر کھڑے ہونے والے اور نافذ کرنے والے بن جاؤ اور اللہ کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ چاہے وہ اللہ کے حق میں گواہی دینا یا حق کی گواہی دینا یا عدل و انصاف کی علمبرداری' ..... "وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِالْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ" ..... "خواہ

وہ تمہاری ذات کے خلاف جارہی ہو' خواہ تمہارے والدین کے یا اور دوسرے رشتہ داروں کے خلاف" ..... یہ بہت اہم بات ہے اور سورۃ المائدہ جو اس کا جوڑا ہے اس میں پھر یہ مضمون آرہا ہے۔ جیسا کہ میں نے کئی مرتبہ عرض کیا ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں کم سے کم دو جگہ ضرور ہوں گے اور اس میں ترتیب عکسی ہوگی اس کی ایک نمایاں مثال یہ ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ میں فرمایا۔ "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ" ..... یعنی تم اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ اور عدل وانصاف کی گواہی دینے والے بنو..... " وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ط" یعنی ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی دشمنی' اور ذاتی عناد کی وجہ سے تم عدل سے کام نہ لو' جانبداری اختیار کر لو اور عدل کو چھپالو اور حق وانصاف کی گواہی کا اظہار نہ کرو ..... "اِعْدِلُوْا ق ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ..... " دشمنی اور محبت سے بالاتر ہو کر عدل وانصاف کا قول ہو۔ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے ..... " وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط" ..... اور تقویٰ کی روش اختیار کئے رکھو..... اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ ..... اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ یقیناً اس سے باخبر ہے۔ پھر یہی مضمون سورۃ الانعام میں آیا۔ مصحف میں یہ تین سورتیں اسی ترتیب سے آتی ہیں..... سورۃ النساء' سورۃ المائدۃ' سورۃ الانعام۔ جامع ترین انداز میں فرمایا جس میں سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ دونوں کی آیات کا ایک ایک حصہ جمع ہو گیا ہے۔ فرمایا "وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی ج" یعنی اور جب بھی تم کسی مسئلے میں زبان کھولو تو عدل سے کام لو' انصاف کرو' خواہ وہ بات تمہارے قرابت داروں کے خلاف جارہی ہو۔ تو اس وقت میں ان ہدایات کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ عرض کر رہا ہوں۔

سردار صاحب کی دو بڑی غلطیاں

میں نے پوری تقاریر حرف بہ حرف پڑھی ہیں جو کچھ کہ نوائے وقت میں چھپا ہے اس کا بھی ایک ایک حرف پڑھا ہے اور پھر جو متن سردار صاحب کی طرف سے تقسیم کئے گئے تھے اس کا بھی ایک ایک حرف پڑھا ہے۔ اب میں ان سب کو لفظاً زیر بحث نہیں لانا چاہتا' نہ ہی اس کا کوئی موقع ہے' لیکن جو میرا نتیجہ ہے وہ میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں میرے نزدیک سردار صاحب سے دو بہت بڑی بڑی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ ایک جسے میں غلطیٔ اوّل کہہ رہا ہوں اور خاص اس اعتبار

سے کہہ رہا ہوں کہ سردار عبدالقیوم صاحب مجاہدِ اوّل ہیں اور ان کی اس حیثیت پر اگر کسی نے طعن کیا ہے تو میرے نزدیک زیادتی کی ہے۔ جہادِ کشمیر کے آغاز میں پہلی گولی چلانے کی حقیقت مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اگر واقعتاً یہ سعادت ان کے حصے میں آئی ہے تو یہ فضیلت اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کی ہے اور اب اختلاف کے پیشِ نظر اس پر بھی خواہ مخواہ زبان طعن دراز کرنا' یہ روش میرے نزدیک انسان کے عدل وانصاف سے دور ہو جانے کا مظہر ہے۔

اس معاملے میں مجاہد اول کی میری دانست میں غلطی اول یہ ہے کہ انہوں نے خواہ مخواہ' بغیر کسی ضرورت کے علامہ اقبال کی ذات اور ان کی شخصیت کو اس بحث کے اندر گھسیٹ لیا حالانکہ معاملہ تو جسٹس جاوید اقبال صاحب کا تھا اور انہوں نے کوئی بات علامہ اقبال کے کسی حوالے سے نہیں کی تھی اب محض یہ بات کہ وہ پسرِ اقبال ہیں اس لئے ان کی بات کو اقبال کی طرف منسوب کر دیا جائے یا اس کے حوالے سے بات لازماً علامہ اقبال تک پہنچا دی جائے' اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی! میں ان کی نیت پر حملہ نہیں کرتا' ان کا حمیتِ دینی اور سنتِ رسولؐ کی اتباع کا جذبہ یقیناً بہت قیمتی ہے لیکن جیسا کہ میں نے خود دو مرتبہ آج اپنی گفتگو میں کہا ہے کہ جذبات ہی میں اس کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے کہ آدمی جذبات کی رو میں بہہ کر کسی غلط رخ پر چل نکلے۔ چنانچہ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ انہوں نے خواہ مخواہ جذبات میں آکر ہمالیہ جیسی بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ اس معاملے میں وہ جسٹس جاوید اقبال صاحب کے نظریات پر جتنی چاہتے ڈٹ کر تنقید کرتے برملا اور علی رؤس الاشہاد کرتے۔ جاوید اقبال صاحب ان کے سامنے موجود تھے اور اگر بالفرض کسی تقریر میں موجود نہ بھی ہوں تو ناروے میں بہرحال موجود تھے' ان تک بالواسطہ بات پہنچ سکتی تھی۔ انہوں نے غالباً قائداعظم کی ۱۹۴۷ء کی تقریر کا حوالہ تو دیا بھی تھا لیکن علامہ اقبال کا تو کوئی حوالہ نہیں دیا انہوں نے جو کہا وہ ان کا اپنا فکر اور اپنی سوچ ہے۔ اس میں بہرحال سامعین کے درجے میں ایک بات ہو سکتی ہے کہ وہ انہیں جسٹس جاوید کی حیثیت سے نہ دیکھ رہے ہوں بلکہ پسرِ اقبال کی حیثیت سے دیکھ رہے ہوں لیکن اس کی وجہ سے یہ ضروری نہیں تھا کہ سردار صاحب خواہ مخواہ علامہ اقبال کی ذات یا ان کی شاعری کو وہاں زیر بحث لے آتے اور اس میں پھر یقیناً تو ازن کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹا ہے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ مرزا محمد منور صاب نے جو تین اشعار کہے ہیں اس کا کم سے کم پہلا مصرعہ تو صد فیصد درست ہے۔

ع "تھا ناروے میں آپ کا اسلوب ناروا۔"

یہ یقیناً ان کی دوسری بڑی غلطی ہے۔ جس انداز میں انہوں نے گفتگو کی ہے وہ فی الواقع ناروا تھا۔ گویا کہ وہ خود کسی نہایت بلند سطح (High Pedastal) پر کھڑے گفتگو کر رہے ہیں اور علامہ اقبال کی شخصیت تو ان کی نگاہوں میں بہت نیچے ہے۔ پھر ان کے عدم توازن کا یہ پہلو بھی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے اقبال کی شاعری کو قرآن سے جاملایا۔ اگر واقعتہً صغریٰ کبریٰ جوڑ لیا جائے کہ کچھ لوگ اس وجہ سے علامہ اقبال کے کلام سے صحیح تاثر نہیں لے رہے اور اس کی تاثیر ظاہر نہیں ہو رہی کہ قرآن مجید سے بھی بعض لوگ غلط تاثر اخذ کر لیتے ہیں اور اپنے بارے میں خود قرآن نے کہا ہے کہ "یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا" اس لئے میں روکتا ہوں کہ لوگ اقبال کا کلام نہ پڑھیں اس سے تو منطقی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پھر قرآن کو بھی نہیں پڑھنا چاہئے مبادا کہ اسے پڑھ کر کوئی گمراہ ہو جائے۔ یہ ان کا وہ عدم توازن ہے اور جذبات کی رو میں بہہ کر انہوں نے جس انداز میں گفتگو کی ہے۔ اس میں یقیناً توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ اور پھر ہمیں تو حضورؐ کی تلقین و تعلیم یہ ہے کہ "اُذْكُرُوْا مَوْتَاكُمْ بِالْخَيْرِ" یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ آپ اپنے بزرگوں کو معبود بنالیں اور انہیں ہر تنقید سے بالاتر سمجھیں ان پر تنقید کرنا کوئی حرام نہیں ہے، لیکن "اُذْكُرُوْا مَوْتَاكُمْ بِالْخَيْرِ" کا اصول بالعموم یہ ہو گا کہ عام طور پر ان کا ذکر خیر اور بھلائی سے ہونا چاہئے۔ بلکہ اس حدیث کے اگلے ٹکڑے میں تو اس نوعیت کے الفاظ آئے ہیں۔ فَاِنَّهُمْ قَدْ بَلَغُوْا اِلٰى مَا عَمِلُوْا (اَو کما قال صلّی اللہ علیہ وسلّم) یعنی انہوں نے جو عمل کیا تھا اس تک وہ پہنچ چکے۔ اب تم خواہ مخواہ ان کے بارے میں زبان طعن دراز کرو تو اس کا کیا حاصل ہے؟ "تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ج وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○" ...... (ترجمہ) "وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی، ان کو ان کے اعمال (کا بدلہ ملے گا) اور تم کو تمہارے اعمال کا اور جو عمل وہ کرتے تھے ان کی پرسش تم سے نہیں ہو گی۔"

اسلاف سے اختلاف میں احتیاط ملحوظ رہے!

علامہ اقبال سے بعض معاملات میں میں بھی اختلافِ رائے کرتا ہوں اور انہی اجتماعات جمعہ میں میں نے بعض پہلوؤں سے اس کا اظہار بھی کیا ہے لیکن ادب و احترام کے ساتھ اور ان کے مقام اور مرتبے کو سامنے رکھتے ہوئے اسی طرح کسی کو صحابہ کرامؓ سے بھی اختلاف ہو سکتا ہے لیکن

بہرحال جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہمارا اہل سنّت کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کی نیّتوں میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ ان کے معاملے میں "اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْل" کا اصول سامنے رہے گا۔ صحابیؓ سے بھی اجتہادی غلطی ہو سکتی تھی لیکن اسلاف کا ذکر جب بھی ہو خیر کے ساتھ ہو کسی معاملے میں اختلافِ رائے کا اظہار ناگزیر ہو جائے تو اس کا اسلوب نہایت ہی مودب ہونا چاہئے اور ان کے مقام و مرتبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات ہونی چاہئے۔ تو اس پہلو سے سردار صاحب کی تقریر یقیناً قابل اعتراض ہے۔ اس میں اس طرح کے جملے بھی ہیں اقبال کے حلقے سے یا اقبال کے پڑھنے پڑھانے والے یا اقبال کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لینے والے کسی ایک شخص کو بھی میں نے نہیں دیکھا کہ وہ دین کے اوپر عمل پیرا ہو اور یہ کہ علامہ اقبال کے کلام سے تاثیر سلب کر لی گئی ہے اور یہ کہ اقبال نے بدعملی کی روش اختیار کر رکھی تھی۔ اب دیکھئے بدعملی کا لفظ یہاں انتہائی غیر مناسب ہے۔ اگر کہیں کچھ کہنا بھی ہو تو کم عملی یا کم کوشی بھی کہا جا سکتا ہے جیسے اقبال نے لفظ استعمال کیا کہ ؎

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بےذوق نہیں راہی

ذرا اور اس سے بھی زیادہ سخت بےعملی کا لفظ بھی کوئی انسان لے آئے۔ لیکن بدعملی کا لفظ میرے نزدیک زیادتی ہے۔

پھر اس کے بعد ایک سیدھا سادا راستہ سردار صاحب کے لئے کھلا ہوا تھا۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اس راستہ کو اختیار نہیں کیا یعنی ایک چھوٹے سے بیان میں معذرت ہو جاتی۔ اور اس میں بھی وہ پورا الزام جسٹس جاوید اقبال صاحب پر رکھ سکتے تھے کہ انہوں نے ایسی بےسروپا اور اس قدر غلط باتیں کیں کہ میں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا۔ اور اپنی حمیّتِ دینی، نظریۂ پاکستان کے ساتھ اپنی وفاداری اور سنّتِ نبویؐ اور اتّباعِ نبویؐ کی جو اہمیت میری نگاہ میں ہے اس کے پیشِ نظر میں توازن قائم نہ رکھ سکا اور کچھ ناروا اور نازیبا الفاظ میری زبان سے نکل گئے جس پر میں معذرت خواہ ہوں۔ اگر وہ یہ الفاظ کہہ دیتے اور اسی پر اکتفاء کرتے تو سارا مسئلہ ختم ہو جاتا اور بات آگے نہ بڑھتی اور اب بھی ایک حوالے سے میں نے کوشش کی تھی کہ انہیں پیغام پہنچا دوں۔

میرے نزدیک انہوں نے اہل لاہور یا پورے ملک کے سامنے اپنے موقف کے اظہار کا طریقہ بھی غلط اختیار کیا ہے۔ میرے نزدیک اس وقت جو صورت حال ہے اس کے اعتبار سے "جنگ

فورم" کو اس کا مقام بنانا حکمت کے خلاف ہے وہ صاحب حیثیت ہیں' آزاد کشمیر کے صدر ہیں اور یہاں بھی ان کی نمایاں سیاسی حیثیت ہے وہ کسی ہال میں اہتمام کر کے لوگوں کو وہاں بلا کر کھلم کھلا اپنی بات ان کے سامنے رکھتے اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے۔ میں نے خود جنگ فورم کے اس اجلاس میں جانے کے لئے پاس حاصل کئے تھے تاکہ میں خود براہ راست سنوں اور چونکہ میں اعلان بھی کر چکا تھا کہ مجھے جمعہ کے اس اجتماع میں اس کے متعلق گفتگو کرنی ہے لیکن کسی ذریعے سے اڑتی سی یہ بھنک میرے کان میں پڑی کہ جنگ والے مجھے اپنے پینل میں رکھنا چاہتے ہیں اور مجھے اپنے بعض سابقہ تجربات کی بناء پر یہ معلوم تھا کہ ایسے مواقع پر آدمی اپنی بات پوری طرح سے کہہ نہیں سکتا اور اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں ویسے میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی میں طویل سفر کر کے آیا تھا چنانچہ میں وہاں نہیں گیا۔ اگرچہ یہ بات وہاں غلط بیان کی گئی ہے کہ مجھے دعوت دی گئی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں اس کی وضاحت کر دوں۔ اگر مجھے باضابطہ دعوت ہوتی تو میں باضابطہ معذرت کرتا یا وہاں حاضر ہو جاتا۔ لیکن مجھے کوئی باضابطہ دعوت اس پینل میں شرکت کی نہیں تھی۔ البتہ میرا اپنا ارادہ تھا کہ میں خود جا کر ساری بات سنوں تاکہ میں اس کے متعلق اپنی رائے قائم کر سکوں۔ بہرحال میری رائے میں سردار صاحب کو اظہارِ رائے کے لئے اپنے طور پر کوئی اور ذریعہ اختیار کرنا چاہئے تھا۔

پھر یہ کہ انہوں نے جنگ فورم میں کوئی ڈھائی تین گھنٹے کی تقریر کی ہے اس کے بعد سوال و جواب بھی ہوئے لیکن اس کا ابھی ایک لفظ بھی چھپا نہیں ہے' جب چھپے گا تو سامنے آئے گا کہ کیا سوال جواب ہوئے۔ لیکن یہ سارا کھکھیڑ مول لینے سے معاملہ سلجھنے کے بجائے مزید الجھ رہا ہے۔ اس کے بجائے بہتر شکل وہی تھی جو میں نے ایک ذریعے سے ایک درخواست کی شکل میں ان تک پہنچائی بھی تھی کہ آپ ایک مختصر سا بیان دے کر اس معاملہ کو ختم کیجئے اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ..... عذرِ گناہ بدتر از گناہ..... کی شکل بنتی چلی جاتی ہے۔ اور معاملات الجھتے چلے جاتے ہیں اور اس میں لوگوں کے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بہرحال انہوں نے جو بھی مناسب سمجھا ہے کیا ہے محمد

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند۔

اپنی پالیسیوں کے بارے میں وہ خود ہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں' لیکن اس ضمن میں جو میری رائے ہے وہ میں نے عرض کر دی۔

اپنی پالیسیوں کے بارے میں وہ خود ہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں لیکن اس ضمن میں جو میری رائے ہے وہ میں نے عرض کر دی ہے کہ یقیناً ان سے یہ دو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ایک تو علامہ اقبال کے بارے میں بلاوجہ اور بلاضرورت لب کشائی کرنے کی اور دوسری ان کے متعلق ناروا اسلوب اختیار کرنے کی۔

اقبال ۔ عصرِ حاضر کا ترجمان القرآن

میں یہاں اقبال کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بھی عرض کر دوں اگرچہ آپ حضرات اس سے بخوبی واقف ہیں۔ میری نگاہ میں علامہ اقبال کا مقام بہت بلند ہے اگرچہ میں انہیں نہ تو کوئی ولی اللہ سمجھتا ہوں' نہ ہی اپنے لئے اسوہ اور واجب التقلید اور واجب الاتباع لیکن فکر کے اعتبار سے میرے نزدیک اس عہد حاضر میں ان سے زیادہ قرآن کی صحیح ترجمانی کسی شخص نے نہیں کی۔ میں انہیں اس دور کا ترجمان القرآن سمجھتا ہوں۔ قرآن کے فکر اور قرآن کی حکمت کا شارح اور ترجمان اور وہ بھی اس دور جدید کا۔ اس اعتبار سے کہ اس دور کے علمی مسائل' فلسفیانہ مغالطے اور تمدنی پیچیدگیاں..... یہ اس درجے گھمبیر معاملات ہیں کہ ہر شخص کی سمجھ میں آنے والے نہیں ہیں انہیں وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کی عمران کے اندر بیتی ہو۔ جیسے کہ وہ خود کہتے ہیں ؎

"کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیلؑ"

یعنی مجھے اس تہذیبِ حاضر اور تمدنِ نو' فلسفۂ جدیدہ اور نظریاتِ دورِ حاضر کی آگ میں اللہ نے اسی طرح ڈالا ہے جیسے حضرت ابراہیمؑ کو آتشِ نمرود میں ڈالا تھا۔ اور اقبال اس آگ سے کندن بن کر نکلے ہیں۔ پھر انہوں نے جس اعتماد' وثوق اور گہرے یقین کے ساتھ اسلام کے مؤقف کا دفاع کیا ہے بلکہ صرف دفاع ہی نہیں کیا جارحانہ انداز میں فلسفۂ مغرب پر تنقید کر کے فکر و فلسفہ اور نظریاتی سطح پر اسلام کے لئے مدافعانہ کے بجائے آگے بڑھنے والی ایک پوزیشن فراہم کی ہے۔ یہ کوئی عام کام نہیں تھا۔ یہ ایک بہت بڑا کام تھا جو انہوں نے کیا ہے۔

یہ چار عناصر ہوں تو . .

اقبال کے مقام سے آگاہی کے لئے پہلے چار چیزیں نوٹ کر لیجئے! اگر کسی شخص میں یہ چاروں

چیزیں جمع ہو جائیں تو وہ تو اس عہد حاضر کا امام بن جائے گا۔ اور امام مہدی ہی شاید وہ شخص ہوں جن میں یہ چاروں چیزیں جمع ہوں گی۔ اس وقت تو ان چار میں سے ایک بھی اگر کسی شخص میں مل جائے تو وہ ہمارے لئے بڑا قابل قدر اور لائق محبت ہے۔ لیکن اس کے بارے میں یہ طرزِ عمل بھی قطعاً درست نہیں کہ بقیہ تین چیزوں کو بھی خواہ مخواہ اس کی ذات میں فرض کر لیا جائے۔ محبت و عقیدت کے غلو میں آنکھیں بند کر لی جائیں اور ان تین چیزوں کے فقدان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ لیکن اگر ایک چیز بھی موجود ہے تو ماننا چاہئے کہ اس شخص کی ایک عظمت اور ایک مقام و مرتبہ ہے اور اس پہلو سے اگر اس نے امّت کو کوئی فائدہ پہنچایا ہے تو اس کے لئے زیرِ بارِ احسان ہونے کی کیفیت ہونی چاہئے۔

یہ چار چیزیں گن لیجئے۔ یہ ہیں فکر، ذکر، علم اور عمل۔ ذکر و فکر کو تو علامہ اقبال نے بھی جمع کیا اور ان سے پہلے مولانا رومؒ نے بھی فرمایا ؎

ایں قدر گفتیم باقی فکر کُن
فکر گر جامد بود رَو ذکر کُن!

اتنا کچھ ہم نے تمہیں سمجھا دیا باقی اب فکر کرو، سوچ و بچار سے کام لو اور اگر فکر جامد ہو جائے تو جاؤ پھر ذکر کرو۔ ؎

ذکر آرد فکر را در اہتزاز
ذکر را خورشیدِ ایں افسردہ ساز

جب فکر جامد ہو جاتی ہے اور اسے آگے راستہ نہیں ملتا تو ذکر سے ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جیسے کہ سورج طلوع ہوتا ہے تو ہر چیز کے اندر ایک حرکت و برکت اور چہل پہل نظر آنے لگتی ہے۔ علامہ اقبال بھی کہتے ہیں کہ ذکر و فکر کے اختلاط سے فقرِ قرآنی وجود میں آتا ہے ؎

جُز بہ قرآں ضیغمی روباہی است
فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است

اور ؎

فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر

اور یہ دونوں عاشقِ قرآن بھی ہیں اور ترجمان القرآن بھی۔ مولانا روم کے بارے میں بھی کہا گیا

ہے کہ ؎

مثنویٔ مولویٔ معنوی ہست قرآں در زبانِ پہلوی

اور اقبال نے تو خود بھی کہا ہے کہ ؎ گوہر دریائے قرآں سفتہ ام

یعنی میں نے قرآن مجید کے دریا میں سے موتی چن چن کر پرو دیئے ہیں۔ اور چن دیئے ہیں لوگوں کے سامنے کہ ان کے حسن و جمال سے مسرور اور بہرہ اندوز ہوں۔ تو دونوں کا کمال یہی ہے۔ اس لئے کہ یہی چیز قرآن کہہ رہا ہے اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ○ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ ط وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط ..... یعنی یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں ایک دوام ذکر کہ کھڑے 'بیٹھے' لیٹے' ہر حال میں اللہ کی یاد اور دوسرے فکر۔ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور و فکر۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ اختلاطِ ذکر و فکر کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ کہیں فکر ہے تو ذکر کی لذت سے سرے سے آشنائی ہی نہیں ہے اور کہیں ذکر ہو رہا ہے تو انہوں نے فکر کا دائرہ خالی چھوڑ دیا ہے۔ اِلَّا ماشاءَ اللہ۔

اسی طرح ایک ہے علم اور ایک ہے عمل یعنی علمِ صحیح اور پھر عملِ صحیح۔ ہونا تو چاہئے کہ یہ چاروں ہوں 'علم اور عمل بھی ہو اور ذکر اور فکر بھی ہو۔ میں پھر عرض کر رہا ہوں کہ جس میں یہ چار چیزیں جمع ہو جائیں گی وہ امامِ وقت ہو گا۔ ؎

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

لیکن جب تک وہ شکل نہیں ہو رہی ہے تو اگر اللہ نے کسی کو فکرِ صحیح یا علمِ صحیح دیا ہے تو اسے غنیمت سمجھئے! اب علم اور فکر میں بھی فرق ہے۔ ہمارے علماءِ کرام علم کے خزانے ہیں۔ میں یہ کہا کرتا ہوں کہ وہ علم کے ڈیمز (Dams) ہیں۔ ان کے ہاں بڑا علم ہے جیسے ڈیمز (Dams) میں ہزاروں فٹ گہرا پانی کھڑا رہتا ہے۔ لیکن اسے ہماری بدقسمتی کہہ لیجئے کہ یہاں سے استفادے کے لئے راستے اور واسطے (Channels) استوار نہیں ہوئے۔

فکرِ اقبال کی ہمہ گیریت

علامہ اقبال کا معاملہ یہ ہے کہ وہ فکر کی بہت بلند سطح پر ہیں۔ میں ان کے فکر کا 'اس کی صحت'

جامعیت اور ہمہ گیریت تمام پہلوؤں سے قدر دان ہوں اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے اپنا دل نکال کر اپنے چھوٹے سے کتابچے "علامہ اقبال اور ہم" میں رکھ دیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں انہیں کوئی مفتیٔ اعظم مانتا ہوں۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ وہ اللہ کا بندہ خود اس بارے میں اتنا محتاط تھا کہ اس نے کبھی کسی معاملے میں فتویٰ نہیں دیا۔ انہیں انتہائی شدت کے ساتھ احساس تھا کہ شریعتِ اسلامی کی تدوینِ نو ہونی چاہئے اور جو چیزیں ان کے ذہن پر آخری وقت تک مسلط رہی ہیں ان میں سے ایک چیز یہ بھی تھی لیکن یہ ایک معلوم و معروف حقیقت ہے کہ انہوں نے یہ کام خود یکہ و تنہا کرنے کی ہمت نہیں کی' اس لئے کہ اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ یہ کام تو وہ شخص کر سکتا ہے جس کی پوری زندگی حدیث نبویؐ کے پڑھنے پڑھانے' آئمہ دین اور فقہاء کے استدلات پر تفکر اور حدیث و فقہ اور اصول کی عظیم مجلّدات کی عرق ریزی کے اندر گزری ہو صرف قرآن مجید کی گہرائی میں غوطہ زنی وہاں کفایت نہیں کرے گی۔ اسی لئے انہوں نے مولانا انور شاہ کشمیریؒ کو متعدد خطوط لکھے۔ مولاناؒ بعض اسباب کی بنا پر دارالعلوم دیوبند چھوڑ کر جا رہے تھے' چنانچہ علامہ اقبال نے یہ موقع غنیمت سمجھا۔ شاید اس سے پہلے بھی کچھ خطوط لکھے ہوں لیکن اس موقع پر تو انہوں نے مولانا کی خوشامد تک کی۔ اور یہ اقبال کی عظمت کی دلیل ہے کہ اپنے اس مقام و مرتبہ کے باوجود جس پر انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی ہی میں فائز کر دیا تھا' اس وقت مولانا سے درخواست کی کہ آپ ڈابھیل جانے کے بجائے لاہور آئیے ۔ فقہِ اسلامی اور قانونِ اسلامی کی تدوینِ نو کے ضمن میں میں نے جدید نظریات کا مطالعہ کیا ہے' میں بار ایٹ لاء ہوں' فلسفہ قانون سے واقف ہوں اور آپ نے شریعت کی وادیوں کے اندر پوری عمر بسر کی ہے۔ ہم دونوں جمع ہو جائیں تو یہ کام ہو جائے گا۔ لیکن جب وہ نہیں آ سکے تو علامہ نے یہ کام نہیں کیا۔ یہ ضروری ہے کہ انسان کو اپنی حدودِ عمل (Limitations) کا بھی علم ہو کہ وہ کیا کام کر سکتا ہے' کیا نہیں کر سکتا!۔ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے! کسی عظیم شخصیت کے لئے ان تمام چیزوں کا جان لینا بہت ضروری ہے ورنہ اگر کسی ایک پہلو سے کوئی بہت عظمت عطا ہو گئی ہو اور وہ دوسرے پہلو سے بھی یہی سمجھے کہ میں اسی مقام و مرتبہ اور اُسی درجے پر پہنچ گیا ہوں تو وہ ایک پہلو جس میں اُسے مقام حاصل ہوا ہے اس کی افادیت بھی ختم ہو جائے گی۔

اقبال بڑا اپدیشک ہے...

جہاں تک اتباعِ شریعت کی کمی ہے تو آخر کون شخص ہے جو اس سے واقف نہیں ہے۔ کوئی شخص یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ نماز نہیں پڑھتے تھے لیکن یہ عام طور پر معلوم ہے کہ مسجد میں جا کر لوگوں کے ساتھ نماز با جماعت ادا کرنا ان کے معمولات میں نہیں تھا۔ اسی طرح انہوں نے آخری وقت تک داڑھی نہیں رکھی۔ اس پر اگر کسی کو افسوس یا رنج ہے تو وہ اس کو اپنی جگہ پر رکھے۔ ان کی اپنی زندگی میں یہ باتیں ہوتی تھیں اور ہم عصر لوگ ان کے منہ پر یہ تنقیدیں کرتے تھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس میں بھی ان کی عظمت کا پہلو ہے کہ اس کا کبھی برا نہیں منایا۔ انہوں نے خود بھی کہا کہ ؎

اقبال بڑا اپدیشک ہے' من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا' کردار کا غازی بن نہ سکا

اب چاہے یہ بات ایک لطیفہ یا مزاحیہ انداز میں کہی گئی ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ 'بانگِ درا' کی اس آخری نظم کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ اسے ظریفانہ کہا جائے۔ اسے نہ معلوم کیوں 'ظریفانہ کلام' میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ تو بالکل اکبرالٰہ آبادی کا سا انداز ہے کہ عارفانہ خیالات و جذبات کو بڑے سہل اور عام فہم انداز میں پیش کر دینا۔ اس میں جو کمال اکبرالٰہ آبادی کو حاصل تھا اس کی ایک جھلک آپ کو یہاں ملتی ہے۔ اس لئے کہ جب وہ یہ کہتے ہیں ؎

کیا خوب امیرِ فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا
تُو نام و نسب کا حجازی ہے' پر دل کا حجازی بن نہ سکا

اب یہ کوئی ظریفانہ کلام ہے؟ اس میں تو وہ ایک عظیم حقیقت کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔ اور پھر ان کا وہ شعر ؎

تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذّت اس رونے میں
جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا!

حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان کی کاوشوں میں اس کا خونِ جگر شامل نہیں ہوتا وہ نتیجہ خیز نہیں ہوتیں۔ ان اشعار میں حقائق و معارف کا بڑی اعلیٰ و ارفع سطح پر بیان ہے۔

اقبال کے اپنی کم عملی یا بے عملی کے اعتراف کے ضمن میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی روایت ہے کہ مولانا محمد علی جوہرؒ نے علامہ اقبالؒ سے اُن کے منہ پر کچھ بڑا ہی تلخ سا جملہ کہا تھا وہ جملہ تو میں یہاں پر بیان نہیں کرنا چاہتا' یہ بزرگوں کی باتیں ہیں اور علامہ اقبال نے بھی اس کو ایک بزرگ کی طرف سے ایک بات سمجھ کر بہت ہی متانت کے ساتھ لیکن بڑے ہی لطیف پیرائے میں ٹال دیا کہ مولانا اگر خود قوّال کو ہی حال آجائے تو وہ قوّالی کیسے کرے گا؟ یہ اعترافِ حقیقتِ اقبال کی عظمت ہے اور اس سے ان کا مقام کسی درجے میں کم نہیں ہوتا' اس لئے کہ دورِ حاضر کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر ایمان کے ابدی حقائق اور اسلامی نظامِ حیات خصوصاً اس کے اجتماعی پہلوؤں کو انہوں نے جس اعتماد' جس صحت اور جس وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے' میرے نزدیک اس کی کوئی دوسری نظیر نہیں ہے۔ اگرچہ اس میدان کی بعض دوسری شخصیتیں بھی ہیں لیکن ان کی حیثیت ان کے خوشہ چین کی ہے اگر کوئی شخص اقبال سے اس طور پر استفادہ کرے کہ وہاں سے کوئی نکتہ لے اور پھر وضاحت و تفصیل کے ساتھ اور عام فہم انداز میں اسے بیان کرے تو یقیناً اس کے افادہ کا حلقہ وسیع ہو جائے گا اور یہ خدمت بھی یقیناً اُمّت کے اوپر ایک احسان کے زمرے میں آئے گی۔ بعض حضرات نے اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں وہیں سے اصول مستعار لے کر کافی بلند فکر پیش کیا ہے اور بڑے صحیح انداز میں بات کی ہے لیکن اسلام کے معاشی نظام کے بارے میں ان کی سوچ بہت ہی رجعت پسندانہ ہے۔ اس پہلو سے وہ نہ تو اسلام کی تعلیم ہی کو سمجھ سکے ہیں اور نہ ہی انہیں اس دور کے تقاضوں کا کوئی شعور ہی ہو سکا ہے۔

جسٹس جاوید اقبال صاحب سے

علامہ اقبال کے بارے میں آپ حضرات کے سامنے اپنے احساسات بیان کرنے کے بعد اب میں چند باتیں جسٹس جاوید اقبال صاحب کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی دونوں تقریروں میں وہاں جو خیالات ظاہر ہوئے ہیں اگر وہ ان کے اپنے خیالات اور اپنے نظریات ہیں اور وہ واقعتاً ان کا پرچار کرنا چاہتے ہیں تو انہیں عدالتِ عظمیٰ کے بلند منصب کو خیرباد کہہ کر میدان میں آنا چاہئے انہیں چاہئے کہ وہ ہمہ تن اسی کام میں لگیں اور ان کی اپنی دیانتاً جو رائے ہے اسے پیش کریں لیکن اپنی موجودہ حیثیت سے یہ فائدہ نہ اٹھائیں۔ میں آج سوچ رہا تھا کہ ۱۹۵۳ء کی 'تحریکِ ختمِ نبوت' پر جو کورٹ آف انکوائری (Court of Inquiry) قائم ہوئی تھی اس

میں جسٹس منیر صاحب کا کردار اور رویّہ سخت قابلِ اعتراض تھا۔ وہ بات بات پر علماء کی توہین کر رہے تھے اور علماء سے ان کا بغض و عناد ان کے ایک ایک جملے سے ظاہر ہوتا تھا۔ اُس وقت ملک سعید صاحب نے جو جماعتِ اسلامی کے ایک امیر اور "تسنیم" کے ایڈیٹر تھے اور کورٹ میں جماعتِ اسلامی کی طرف سے وکیل تھے 'ایک بات کہی تھی۔ انہوں نے ایک جملہ بڑی دلیری کے ساتھ کہا تھا کہ آپ جو یہ باتیں کہہ رہے ہیں اور نظریات پھیلا رہے ہیں تو اگر آپ واقعی اس کے پرچارک بننا چاہتے ہیں تو موچی گیٹ میں آیئے اور عوام کے سامنے بات کیجئے! آپ کو عدالت کی اس اونچی کرسی کو اس طریقے سے اپنے نظریئے کے پرچار کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ تو میں جسٹس صاحب سے بھی یہ کہوں گا کہ انہیں اپنے نظریات کی تشہیر کے لئے اپنی اس حیثیت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے۔ بہرحال ایک تو پسرِ اقبال ہونے کی حیثیت سے ان کا ایک مقام اور مرتبہ ہے وہ تو بہرحال رہے گا اور اس کا فائدہ بھی انہوں نے خوب اٹھالیا ہے۔ پچاس برس سے ان کی کتابوں کی کمائی کھائی جارہی ہے اور انہیں یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اقبال کے کلام کو ہوا اور پانی کی طرح سے عام کر دیں۔ اسی طرح ان کی کوٹھی کی قیمت جو انہیں ملی ہے وہ ظاہر بات ہے کہ پسرِ اقبال ہونے کی حیثیت سے ملی ہے۔ بہرحال یہ تو ایک علیٰحدہ پہلو ہے لیکن کم سے کم یہ کہ ملک کی اعلیٰ ترین عدلیہ کا جو ایک مقام ہے اس سے تو انہیں دست بردار ہو کر کھلم کھلا ایک دانشور کی حیثیت سے دیانتاً جو ان کی آراء ہیں وہ انہیں پیش کرنی چاہئیں اور اس میں جو وہ اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور انہیں ٹیلی ویژن پر اظہارِ خیال کا جو موقع مل گیا ہے میرے نزدیک یہ درست نہیں ہے۔

اصل ضرورت قوّتِ ایمانی کی ہے نہ کہ قوّتِ مادّی کی

سردار عبدالقیوم خان صاحب کی جو غلطی ہے وہ اپنی جگہ پر ہے 'لیکن جو معاملات جسٹس جاوید اقبال صاحب کے ہیں ان کے بارے میں میرے جذبات کچھ کم نہیں ہیں اور اس ضمن میں میں چار نکات کے تحت گفتگو کروں گا:

اوّلاً یہ کہ ان کی گفتگو کی بعض باتیں ایسی ہیں جو یقیناً اعلیٰ فلسفیانہ سطح کی ہیں اور ان کی اچھی تعبیریں بھی ممکن ہیں لیکن ان سے علیٰحدہ ہٹ کر انہوں نے ایک تقریر میں پورا زور اس پر صرف کیا ہے کہ علامہ اقبال تو اصل میں قوّت کے قائل تھے اور قوّت سے ان کی مراد تھی مادّی قوت یعنی سائنس اور

ٹیکنالوجی۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ آج کی دنیا میں کون سا ایسا اندھا انسان رہ گیا ہے جسے سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت کا احساس نہ ہو؟ کون بے وقوف آدمی ہو گا جس کے لئے یہ تبلیغ کرنے کی ضرورت ہے؟ کیا مسلمانوں میں اس چیز کی کمی رہ گئی ہے؟ کیا مسلمانوں کو اتنا ادراک و شعور نہیں ہے؟ کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی مسلمانوں نے اپنے لوگوں کو عالمی سطح پر سائنس دانوں کے ہم پلّہ اور برابر لا کھڑا کیا ہے؟ کیا ہمارے ایٹمی ماہرین اس وقت پوری دنیا کو سرپرائز دینے کی پوزیشن میں نہیں آ گئے ہیں؟ کیا ہم پورے عالم اسلام میں واحد وہ ملک نہیں ہیں کہ جنہوں نے اس معاملے میں اس حد تک پیش رفت کی ہے کہ دنیا یہ سمجھ رہی ہے کہ ہم ایٹم بم بنا رہے ہیں؟۔ ایک چیز کہ جو عام ہے 'کھلی ہے 'واضح ہے 'موجود ہے 'ظاہر بات ہے کہ اس کے پرچار کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کا یہ نظریہ ہرگز نہیں تھا۔ اگر یہ اسے ان کی طرف منسوب کرتے ہیں تو غلط کرتے ہیں اسلام نے یقیناً سائنس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے قرآن نے نوع انسانی کو ایک توہماتی دور سے نکال کر حقائق پر توجہ کرنا سکھایا ہے "اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا" یہ یقیناً ایک نئے دور کا آغاز تھا اس نے پرانی مردہ سائنس کو زندہ کیا ہے 'اس میں اضافے ہوئے ہیں۔ ٹیکنالوجی کے میدان میں عالم اسلام کی خدمات ہیں۔ ہمارے ہاں جو سائنسدان اور مفکّرین پیدا ہوئے ہیں ان کا احسان یورپ آج تک مانتا ہے۔ وہاں یہ ساری روشنی غرناطہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں سے گئی تھی۔

یہ حقیقت اپنی جگہ ہے اور مادّی قوّت کی اہمیت مسلّم ہے لیکن اس وقت مسلمانوں کو جس قوت کی ضرورت ہے وہ قوتِ ایمانی ہے۔ اصل میں جو فقدان ہو رہا ہے وہ ایمان و یقین کا ہے ۔

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے !
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

ورنہ دوسرے میدانوں میں کوئی ایسا کمی کا معاملہ نہیں ہے۔ وہ تو ہم آج ان سے بھی لے کر آ سکتے ہیں جس طرح سے وہ قرطبہ 'غرناطہ اور اصفہانیہ کی یونیورسٹیوں سے لے کر گئے تھے۔ لیکن اگر ہمارے نوجوانوں میں یقین ہوتا تو وہ امریکہ میں جا کر آباد نہ ہو جاتے بلکہ واپس آتے 'چاہے یہاں پر ان کو وہ تنخواہیں نہ ملتیں اور وہ سہولتیں نہ ہوتیں 'لیکن اعلیٰ ترین صلاحیتیں حاصل کرنے کے بعد

وہ وہاں کی آسائشوں اور شاندار مستقبل کے پھندے میں گرفتار ہو کر وہاں نہ بیٹھ رہتے۔ تو اصل فقدان ایمان کا ہے' اصل کمی یقین کی ہے اور دراصل ہم شعورِ سمت (Sense of Direction) گنوا بیٹھے ہیں۔ ؎ آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف' چنانچہ اصل رونا تو اقبال نے اس کا رویا ہے اور سردار عبدالقیوم خان صاحب نے اگر وہاں برمحل یہ شعر پڑھا تو صحیح پڑھا ہے' کہ ؎

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

اور ؎

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کیا شے ہے؟ ان چیزوں سے کہیں بلند تر اور ماوراء شے ہے لوح و قلم جس پر بندۂ مومن کو تسلّط اور تصرّف عطا ہوتا ہے۔ بندۂ مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بنتا ہے ؎ (ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ) تو یہ بات وہ اقبال کے فلسفے کے حوالے سے نہ کہیں۔ اور پھر یہ کہ ایک بڑی ہی واضح اور معلوم چیز کو اہلِ مغرب کے سامنے پیش کرنے کا اس کے سوا اور کیا حاصل ہے کہ آپ وہاں کے کچھ لوگوں کو خوش کر لیں کہ یہ مسلمان ہماری ٹیکنالوجی سے مرعوب ہیں اور ہماری سائنسی ترقی کی ہیبت ان پر قائم ہو چکی ہے۔ تو یہ معاملہ سرسیّد احمد خان مرحوم میں بھی تھا لیکن میں انہیں قابلِ معافی سمجھتا ہوں چونکہ وہ اُس دور میں تھے جب یہ چیزیں نئی نئی آئی تھیں۔ مغربی تہذیب کا سورج طلوع ہو رہا تھا اور ہمارا غروب ہو چکا تھا وہ ہمارے فاتح اور حاکم تھے اور ہم مفتوح اور محکوم تھے۔ اس حال میں اگر ایک شخص جو مسلمانوں کا بہی خواہ اور مخلص تھا مغربی تہذیب' مغربی فلسفہ یا مغربی سائنس سے مرعوب ہو گیا تو وہ قابلِ معافی ہے۔ لیکن آج کے اس دور میں ان چیزوں کا پرچار کرنا میرے نزدیک بالکل غیر موزوں اور بے محل ہے اور اقبال کی طرف اس کی نسبت قطعاً درست نہیں ہے۔

قافلۂ ملّت کا حُدی خواں

دوسرے یہ کہ یہ جو کہا گیا کہ علامہ اقبال بین الاسلامی نہیں' بین الانسانی اتحاد کے علمبردار تھے' یہ بات بھی بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ جمال الدین افغانیؒ کے بعد اگر کوئی اتحاد بین المسلمین

کاسب سے بڑا علمبردار ہو سکتا ہے تو وہ اقبال ہے۔ میں نے اپنے کتابچہ میں ان کے لئے عنوان قائم کیا ہے "قافلۂ ملّی کا سب سے بڑا حدی خواں" انکے یہ اشعار آپ کہاں لے جائیں گے ۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ انسانی اتحاد مقصود و مطلوب ہے لیکن اس کا ذریعہ ہو گا اسلام اور ایمان! یہ ناممکن ہے کہ کفر و الحاد اور ضلالت بھی موجود رہے اور انسانی سطح پر اتحاد بھی ہو جائے اس کا آپ محض خواب دیکھ سکتے ہیں۔ بین الانسانی اتحاد اور انسانی سطح پر یکجہتی صرف اسلام کے اتحاد کی بنیاد پر اور اسلامی یکجہتی کے راستے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے کتابچے "قرآن اور امن عالم" میں واضح کیا ہے کہ اسلام واقعتاً رنگ و نسل کی تقسیموں کو ختم کرنا چاہتا ہے۔

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ط

یعنی شرف و بزرگی اور فوقیت و بڑائی کا معیار کردار و تقویٰ کی بنیاد پر ہو' نہ کہ رنگ و نسل' علاقہ و زبان اور پیشہ و جنس کی بنیاد پر۔ جنس کے اعتبار سے یعنی مرد و عورت ہونے کے لحاظ سے بھی کوئی تفریق نہیں ہے۔ اسی طرح پیشہ کے اعتبار سے بھی کوئی اعلیٰ یا ادنیٰ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی جوتی گانٹھ رہا ہو اور وہ کوئی بہت بڑا ولی اللہ ہو اور اللہ کے ہاں اس کا بلند مقام ہو۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اگر وہ بھولے سے بھی اللہ پر کوئی قسم کھا بیٹھے تو اللہ اس کی قسم کی لاج رکھے گا۔ لیکن ان تمام سطحوں سے بالاتر پہلا معاملہ بین الاسلامی اتحاد کا ہے۔

وحدتِ ملّی کے سب سے بڑے حُدی خواں نے اپنے 'خطبات' (Lectures) میں یہ بات تسلیم کی ہے کہ اس وقت کوئی ملّتِ اسلامی بالفعل ایک وحدت کی حیثیت سے موجود نہیں ہے بلکہ جو کچھ ہے وہ مسلمان اقوام ہیں۔ اقبال محض شاعر نہیں تھے۔ ان کی سوچ بڑی عملی' حقیقت پسندانہ اور Pragmatic تھی۔ شاعری میں اس کا امکان موجود ہے کہ جذبے کو ابھارنے کے لئے یہ انداز اختیار کیا گیا ہو' لیکن اپنی نثر خاص طور پر 'خطبات' میں انہوں نے ساری بات بالکلیہ مسائل سے متعلق کی ہے اور اس میں یہ بات بھی کہی ہے کہ سرِدست اگر مسلمان اقوام کی دولتِ مشترکہ وجود میں آجائے تو یہ بھی بہت بڑی کامیابی ہو گی۔ اب یہاں پر کہاں ہے وہ انسانی اتحاد؟ ہاں انسانی اتحاد ہمارا آخری ہدف ہے۔ وہ وقت آئے گا کہ جس کی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے کہ اس رُوئے ارضی پر نہ تو کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر اور نہ ہی کمبلوں

سے بنا ہوا کوئی خیمہ رہ جائے گا جس میں اللہ کا دین داخل نہ ہو جائے ..... "بِعِزِّ عَزِیْزٍ اَوْ بِذُلِّ ذَلِیْلٍ....." یا تو عزت والے کی عزت کے ساتھ یا کسی ذلیل کی ذلت کے ساتھ..... اور یہ دو شکلیں کیا ہیں؟ یا تو لوگ ایمان لے آئیں گے اور ایک ہی حیثیت میں برابر کے ہو کر رہیں گے..... اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ۔ ان میں کوئی اونچ نیچ نہیں..... یا بِذُلِّ ذَلِیْلٍ یعنی جو اسلام نہیں لائے گا پھر اسے نیچے ہو کر رہنا پڑے گا .....یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَدٍ وَّ ھُمْ صٰغِرُوْنَ..... ○ ..... وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں گے اور چھوٹے بن کر رہیں گے۔ اور بالاتر نظام اللہ کا ہو گا۔

البتہ کسی ایک انسان کو بھی جبراً اس کا عقیدہ یا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اور نہ ہی ماضی میں کبھی کسی کو اس پر مجبور کیا گیا ہے۔ پوری تاریخِ اسلامی اس پر گواہ ہے۔ انسانی سطح پر بھی آخری امکانی حد تک اتحاد کی جو صورت ہو سکتی ہے وہ اسی غلبۂ اسلام کے راستے سے ممکن ہے۔ اس کے سوا کوئی اور عملی راستہ ممکن نہیں ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بات بھی اگر وہ اقبال کی طرف منسوب کر رہے ہیں تو غلط کر رہے ہیں۔ وہ خود میدان میں آئیں اور کھل کر بات کریں۔ اور اگر ہم مغالطے میں ہیں تو ہمارے مغالطے رفع کرنا ان کا ایک بہت بڑا جہاد ہو گا اور پھر ہم بھی اپنی رائے پر نظرِ ثانی کریں گے۔ لیکن یہ کہ اپنی اس عظیم سرکاری حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کبھی کچھ بات اُدھر، کبھی کچھ بات اِدھر کہہ کر مغالطے پیدا کرنا دیانتدار حقیقت مناسب بات نہیں ہے۔ تو وہ یا تو اس معاملے کے اندر اپنے اس پرچار کو بند کریں اور یا اُس عہدے کو خیرباد کہہ کر ایک عام دانشور کی حیثیت سے میدان میں آئیں۔ کھلا میدان ہے۔ یہاں پر کسی کے لئے کوئی قدغن نہیں ہے۔ کھلی آزادیاں ہیں۔ وہ آزادیاں جن کے بارے میں کبھی اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا کہ.....

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
گلے میں جو آئیں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسر
اَنَا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

باطل دُوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے

تیسری بات بھی جو انہوں نے کہی ہے میرے نزدیک بہت خطرناک ہے۔ انہوں نے ایک آئیڈیل کا دُم چھلا لگا کر سیکولرازم کو مشرف بہ اسلام کرنے کی کوشش کی ہے۔ سیکولرازم کی آپ کتنی ہی نرم سے نرم تاویل کر لیں لیکن کوئی بڑے سے بڑا دانشور بھی اس کا اسلام کے ساتھ قطعاً کوئی تعلق قائم نہیں کر سکتا۔ آپ آئیڈیل کہیں یا کچھ اور کہیں، لیکن سیکولرازم سیکولرازم رہے گا۔

سیکولرازم کو لامذہبیت کہنا غلط ہے۔ سیکولرازم نام ہے ہمہ مذہبیت کا..... یعنی تمام مذاہب ایک درجے میں، ایک سطح پر۔ اب اس کی عملی شکل ایک ہی ہو سکتی ہے کہ انفرادی معاملات میں ہر ایک مذہب کو کھلی آزادی ہے۔ جو چاہو مانو، جو چاہو عقیدہ رکھو، جسے چاہو پُوجو، جیسے چاہو شادی بیاہ کر لو، جیسے چاہو اپنے مُردے کا حشر کرو۔ اسے دفن کرو، جلاؤ یا پانی میں بہا دو۔ لیکن یہ آئیڈیل سیکولرازم ہے، بالفعل ایسا نہیں ہوتا اس لئے کہ سرکاری ذرائع ابلاغ اور حکومت کے دوسرے وسائل و ذرائع اکثریت کے تصرّف میں ہوتے ہیں جو انہیں اپنے مذہب کے مطابق استعمال کرتے ہیں، نتیجتہً اکثریت کا مذہب غالب رہتا ہے۔ یہی صورت حال ہندوستان میں ہے اگرچہ وہاں اصولی اعتبار سے سیکولرازم ہے۔ اصولی اعتبار سے امریکہ میں بھی آئیڈیل سیکولرازم موجود ہے۔ لیکن بالفعل اس میں جو کمی رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ جو بھی لوگ اکثریت میں ہیں اگر ان کا مذہب کے ساتھ لگاؤ ہے تو سیکولرازم ان کا راستہ نہیں روک سکتا۔ اس لئے کہ سیکولرازم میں اصول یہ ہے کہ اجتماعی معاملات میں شہریوں کی اکثریت کا فیصلہ نافذ ہو گا۔ اس دلیل سے نہیں کہ فلاں مذہب نافذ ہونا چاہئے، بلکہ اس میں راستہ یہ نکل آتا ہے کہ اگر اکثریت کی اپنے مذہب کے ساتھ گہری وابستگی ہے تو اس اصول کے تحت بھی وہ اپنے مذہب کو نافذ کروا سکتے ہیں۔

میرے نزدیک قائداعظم کی ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کے اس جملے کی یہی توجیہہ ہے:

"Very soon the Muslims will cease to be the Muslim and the Hindus will cease to be the Hindu, not in the religious sense, because religion is the private affair of the individuals, but in the Political sense."

"بہت جلد (اس ملک میں) سیاسی اعتبار سے نہ کوئی مسلمان مسلمان رہے گا اور نہ کوئی ہندو، ہندو رہے گا مذہبی اعتبار سے نہیں۔ اس لئے کہ مذہب تو افراد کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔"

اس ایک جملہ میں بالکل دوٹوک انداز میں سیکولرزم کا نکتہ موجود ہے' اور اس کی تاویل و توجیہہ بہت مشکل ہے لیکن میری تاویل کے مطابق اس کی تعبیر یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے نتیجے میں درحقیقت ایک ایسا ملک وجود میں آچکا تھا جس میں عظیم اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ اس سیکولر اصول کے تحت ان پر کوئی پابندی نہیں تھی کہ وہ اپنے نظریات کے مطابق قانون سازی کریں۔ سیکولرازم کا اصول یہی تو ہے کہ بات مذہب کی دلیل سے نہیں' اکثریت کی دلیل سے ہوگی۔ تو اگر کسی ملک کے رہنے والوں کی اکثریت کا اپنے اس مذہب کے ساتھ حقیقی' واقعی' قلبی' ذہنی' اور فکری لگاؤ ہے تو وہ اس راستے سے بھی اور اس چھلنی میں سے بھی چھن کر نظام حکومت کے اندر خود بخود آجائے گا۔ لہٰذا یہ تاویل ہے جو میں نے کی ہے ورنہ غلام احمد پرویز جیسے عاشق قائداعظم کو بھی یہ ماننا پڑا ہے کہ قائداعظم کے اعصاب اس وقت کچھ جواب دے گئے تھے۔ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد حالات کا ایسا دباؤ اور اتنی مشکلات تھیں کہ ان کے زیر اثر یہ جملے ان کے قلم سے یا ان کی زبان سے نکل گئے۔ میں نے لکھا ہے کہ میرے نزدیک قائداعظم کے بارے میں یہ تأثر ان کی توہین ہے۔ وہ تو فولادی اعصاب کے انسان تھے اور بڑی سے بڑی سخت مشکل کے اندر بھی ان کے اعصاب میں کبھی اس طرح کا تزلزل پیدا نہیں ہوا تھا۔ میرے نزدیک ان کے الفاظ کی یہ تاویل قطعاً غلط ہے کہ انہوں نے نظریۂ پاکستان کے بارے میں اس سے پہلے جو کچھ کہا تھا اس پر خط نسخ پھیر دیا۔ بلکہ اصل تاویل یہی ہے کہ انہوں نے حصولِ مقصد کے لئے دوسرا ذریعہ (Channel) اختیار کیا۔ یعنی ایک دم اسلام' اسلام' اسلام کا ڈھنڈورا پیٹ دینا۔ جبکہ وہ فی الواقع نہ ہو' جیسے کہ اس وقت ہوا ہے اور جو دس سال سے اس ملک میں ہو رہا ہے' اس کے نتائج قائداعظم کے نزدیک زیادہ خوفناک تھے۔ اس کے بجائے انہوں نے یہ راہ سجھائی کہ اب آپ کے سامنے میدان کھلا ہے۔ ہندو اکثریت کی رکاوٹ دور ہو چکی ہے۔ اب آپ کے راستے میں کون سی چیز حائل ہے؟ آپ عوام کو تیار کیجئے۔ آپ لوگوں کے اندر نفوذ کیجئے۔ اجتماعی سطح پر قوم کی رائے اسلام کے حق میں استوار کیجئے۔ قوم کے فیصلہ کن رجحان سے اسلام نافذ ہو جائے گا اور کوئی اس کا راستہ روکنے والا نہ ہوگا۔

جسٹس منیر صاحب کا ذکر آج پہلے بھی آیا تھا۔ جسٹس جاوید اقبال صاحب نے ان کی یاد تازہ کر دی ہے..... انہوں نے بھی اس جملے کے اوپر مورچہ لگایا تھا کہ قائداعظم ایک سیکولر ریاست چاہتے تھے' مذہبی اسلامی ریاست نہیں چاہتے تھے۔ اگرچہ میں یہ عرض کر دوں کہ ان دونوں کے

مابین بڑا فاصلہ ہے۔ قائداعظم واقعتہً مُلّائیت یا پاپائیت (Theocracy) کے مخالف تھے۔ تھیوکریسی کا اقبال بھی مخالف تھا۔ تھیوکریسی کا میں بھی شدید مخالف ہوں لیکن اسلامی ریاست کا معاملہ ملائیت (Theocracy) اور جمہوریت (Democracy) کے بین بین ہوتا ہے اور اس میں میں تحسین کا کلمہ کہنا چاہتا ہوں مولانا مودودی مرحوم کے لئے کہ انہوں نے اسلامی ریاست کی نوعیت کے لئے ان دونوں کے درمیان تھیوڈیموکریسی (Theo-democracy) کی ایک نئی اصطلاح وضع کی میں اس پر تین چار خطاباتِ جمعہ میں اظہارِ خیال کر چکا ہوں لیکن میرا احساس ہے کہ اب پھر وقت ہے کہ ان موضوعات پر دوبارہ گفتگو کروں۔ اسلامی ریاست کے بارے میں جو بھی اشکالات پیدا کر دیئے گئے ہیں اپنی امکانی حد تک ہم اس جنگل کو صاف کرنے کی کوشش کریں گے۔ اسلام یقیناً نہ ڈیموکریسی ہے' نہ تھیوکریسی' بلکہ یہ تھیوڈیموکریسی (Theo-democracy) ہے۔ اسلامی ریاست 'خلافتِ عامہ' (Popular Vicegesency) کے اصول پر قائم ہو گی۔ اعلیٰ ترین جمہوری روایات اور اقدار بھی اس کے اندر شامل ہوں گی۔ حریّت و اخوّت و مساوات کا جو اسلامی نظریہ ہے وہ وہاں پر نافذ ہو گا۔ یہی تین الفاظ مغربی جمہوریت میں بھی استعمال ہوتے ہیں اور کمیونسٹ ممالک بھی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے پیشِ نظر ان کی وہ تعبیر ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔ چنانچہ سیکولرازم کے ساتھ آئیڈیل کا لفظ لگا کر اسے مشرّف بہ اسلام نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام اور سیکولرازم میں تباین اور تضاد کی نسبت ہے۔ ان کے مابین بُعدالمشرقین ہے۔ اسلام یقیناً مذہبی سطح پر سب کو کھلی آزادی دے گا۔ لیکن اسلامی ریاست کے اجتماعی معاملات سارے کے سارے اسلام کے حوالے سے طے ہوں گے۔ اگر نظریۂ پاکستان کی کوئی اور تعبیر کسی کے ذہن میں ہو تو بہرحال ہم اس سے اعلانِ برأت ضروری سمجھتے ہیں' چاہے وہ ہماری کتنی ہی محبوب ترین شخصیت کے فرزند ہی کیوں نہ ہوں!

میں سمجھتا ہوں کہ سردار عبدالقیوم صاحب کا ردِّعمل بھی انہی Issues کی بنا پر تھا اور بجا تھا لیکن وہ اس میں خواہ مخواہ علامہ اقبال کی ذات کو زیر بحث لے آئے حالانکہ ان نظریات کی نسبت سرے سے علامہ اقبال کی ذات اور ان کی فکر کے ساتھ صحیح نہیں ہے اقبال کے تذکرے میں انہوں نے جو انداز اختیار کیا اس کے بارے میں میں پھر عرض کروں گا کہ مرزا محمد منور صاحب کا وہ مصرعہ صد فیصد درست ہے کہ ؎

"تھا ناروے میں آپ کا اسلوب ناروا"

اور اب بھی میں ان سے عرض کروں گا کہ اس معاملے کو آگے نہ بڑھائیں۔ ان کا ایک مقام ہے' حیثیت ہے' صدرِ آزاد جموں و کشمیر ہیں اور اگر مجاہدِ اوّل بھی ہیں تو یہ ایک رتبہ ہے جو اللہ نے انہیں دیا ہے

"یہ رُتبہُ بلند ملا جس کو مل گیا!"

بہر حال ان کے بارے میں معلومات یہی ہیں کہ متبعِ شریعت ہیں یہ ساری چیزیں قابلِ قدر ہیں۔ وہ بہت آسانی کے ساتھ چند جملے کہہ کر اس معاملے کو ختم کر سکتے ہیں کہ پھر کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ رہے ورنہ یہ قیل و قال اور قالَ اور اَقُولُ کا سلسلہ چلتا رہا تو بحث الجھے گی اور اس کا حاصل کچھ نہیں نکلے گا۔

واپڈا بانڈز ــ سُود کی ایک نئی ترغیب

انتہائی بدقسمتی ہے اس ملک اور اس قوم کی کہ گزشتہ دس سال سے 'اسلامائزیشن' کے نام پر اس سے دھوکہ کیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں میں جسٹس جاوید اقبال صاحب کی بھرپور تائید کرتا ہوں کہ اسلامائزیشن کا موجودہ عمل یقیناً منافقانہ ہے۔ اس کے اندر اسلام کے ساتھ کوئی وابستگی اور وفاداری ہمیں نظر نہیں آتی۔ اور اس کی جو مدافعت کی ہے سردار عبدالقیوم صاحب نے اس سے میں کھلم کھلا اعلانِ برأت کرتا ہوں۔ وہ چاہے ضیاء الحق صاحب کے کتنے ہی مُرشد بن گئے ہوں اور چاہے انہوں نے تواضع میں مرشد کہہ دیا ہو اور انہوں نے انتہائی تواضع سے یہ حیثیت قبول فرمالی ہو اور وہ ان کی وکالت کا جتنا بھی کام کرنا چاہیں کریں' لیکن میں ان کی اس مدافعت سے اعلانِ برأت کرنا چاہتا ہوں اور اس سے بھی اعلانِ برأت کرنا چاہتا ہوں جو ابھی ابھی سی باتیں انہوں نے کی ہیں جیسے کہ قرآن مجید کے بارے میں اگر تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ قرآن پڑھنا نہیں چاہئے۔ اسی طریقے سے اسلامی نظام کا لانا کوئی ضروری نہیں ہے...... اس کے بغیر بھی ہمارے اسلام میں کوئی نقص نہیں ہے...... اسلام اور ہے' اسلامی نظام اور ہے...... نہ معلوم وہ کس فکری الجھاؤ کے اندر مبتلا ہیں! کہنا تو یہ چاہئے کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے بغیر ہمارے اسلام میں یقیناً نقص موجود ہے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ تم کافر ہو اگر تم اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے! کہاں لے جائیں گے قرآن مجید کے اس فتوے کو؟ ...... "وَمَنْ لَّمْ

يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ ..... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ " آپ اس فلسفے کو لانا چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام کا مطلب اسلام نہیں ہے۔ ہم پہلے بھی مسلمان تھے' آئندہ بھی رہیں گے' سو برس تک بھی اسلامی نظام نہیں آتا تو مسلمان رہیں گے۔ یہ بات اس طرح کہنے کی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے ہم کسی کو کافر نہیں کہتے لیکن بہرحال ایک کمی کا احساس تو ہو۔ احساسِ زیاں تو باقی رہے۔ ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اس ملک میں اسلام کے بارے میں یقیناً منافقت کا معاملہ ہوا ہے۔ ایک طرف کھلم کھلا یہ دعوے ہو رہے ہیں کہ سود ختم ہو گیا ہے اور دوسری طرف سود کی ترویج جتنی اس دور میں ہوئی ہے کبھی نہیں ہوئی پہلے این۔ ڈی۔ ایف۔ سی بانڈز کا اجراء ہوا جس قدر چاہو کالا دھن لاؤ اور جس طرح چاہو سفید کروالو اس پر نہ کوئی زکوٰۃ ہوگی' نہ انکم ٹیکس۔ اب اسی نوعیت کے واپڈا بانڈز جاری کئے گئے ہیں جو انکم ٹیکس اور زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں تو سب سے زیادہ تحفظ انہی کو دیا جا رہا ہے جنہوں نے کالا دھن سمیٹ رکھا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے لئے ایک بہتر راستہ موجود تھا۔ کالا دھن آپ اسی کو کہتے ہیں نا کہ لوگوں نے جو ٹیکس ادا نہیں کئے اور خلافِ قانون ذرائع سے دولت اکٹھی کی ہے۔ اس طرح غلط طریقے پر ارتکازِ دولت ہو گیا ہے۔ اس کے لئے بہترین راستہ یہ تھا اور کئی مرتبہ یہاں کے لوگوں نے ایسی تجاویز بھی پیش کی ہیں کہ ایک دفعہ ایک تاریخ مقرر کر دی جائے کہ سب لوگ اس تاریخ تک اپنے اس دھن کو ظاہر کر دیں تو اس میں سے کوئی کٹوتی نہیں ہوگی۔ اگر یہ ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ سارا دھن معمول کے کاروباری وسائل (Normal Bussiness Channels) میں لگتا اور انہی میں سرمایہ کاری ہوتی تو لوگوں کے لئے کام نکلتے اور روزگار کے مواقع میسّر آتے۔ اس طرح وہ تمام دولت گردش میں آ سکتی تھی جو اب تک لوگ اپنے کھاتوں میں ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ اور اگر یہی کچھ کرنا تھا کہ کوئی ٹیکس نہیں ' کوئی شناخت نہیں ' کوئی پوچھ گچھ نہیں کہ یہ کہاں سے آیا' تو سود کی لعنت میں مزید اضافہ کرنے کے بجائے بہتر صورت اختیار کر لی جاتی۔ لیکن اس لعنت میں ہمارے قدم پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے ہی بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور خواہ مخواہ محض لیبل کے طور پر سودی

(باقی صـ۶۷ پر)

۵ تا ۱۱، اپریل ۱۹۷۶ء

سیّد مودودی نے یہ کیا کہہ دیا؟

سیّد مودودی نے کیا فرما دیا ہے — یہ کیا کہہ دیا انہوں نے ہے — انتخابات اسلامی انقلاب کا واحد ذریعہ نہیں ہیں، اور وضاحت اس کی یوں کی کہ جمہوریت میں اور بھی بہت سے ذرائع ہیں جن سے کام لیا جا سکتا ہے، اگر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہم خیال بنا یا جائے، اس راستے میں آنے والی رکاوٹوں کی پرواہ نہ کی جائے، قید و بند کی صعوبتیں بھی درپیش ہوں تو راہِ مستقیم نہ چھوڑی جائے۔ آبادی کے بڑے حصّے میں زیادہ سے زیادہ لٹریچر پھیلایا جائے۔ جب آبادی کی کثیر تعداد ہم خیال ہو جائے گی، تو حکمرانوں پر دباؤ ڈالا جا سکے گا اور انہیں جھکنے پر مجبور کیا جا سکے گا۔ دلیل اس کی یوں دی کہ ماضی قریب میں ہندوستان سے انگریز کو بھگانے کے لیے اسے کسی انتخاب میں شکست نہیں دی گئی تھی، بلکہ رائے عوام کے ذریعے ہی بھگایا گیا تھا۔

سیّد محترم کے ان خیالات کو بار بار پڑھیے اور پھر سوچیے، کیا کہہ دیا انہوں نے؟ اس نتیجے پر پہنچے بغیر چارہ نہیں رہے گا کہ جناب سیّد نے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، اسے واشگاف کیا ہے اور ٹھٹک ٹھٹک کر مایوس ہو جانے والوں یا چل چل کر تھک جانے والوں کو امید سے آگاہ کیا ہے، ذوقِ سفر سے ان کا تعارف کرا دیا ہے۔

الحمد للہ

کہ پندرھویں صدی ھجری کے آغاز پر یکم تا بارہ ربیع الاوّل
پاکستان ٹیلی ویژن نے سیرت النبیؐ کے موضوع پر

رسولِ کاملؐ

کے عنوان سے

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی جو ۱۲ بارہ تقاریر

نشر کی تھیں، اب ایک باقاعدہ معاہدے کے تحت ٹیلی ویژن کارپوریشن
سے اُن کی ریکارڈنگ حاصل کر کے اُن تمام تقاریر کا ایک

ویڈیو کیسٹ

تیار کیا جا رہا ہے۔ جو یکم مارچ ۸۸ء تک مارکیٹ میں دستیاب ہو سکے گا (ان شاء اللہ)
افادۂ عام کے پیشِ نظر اس کی خصوصی رعایتی قیمت صرف -/۱۵۰ روپے مقرر کی گئی
ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہو گا

اپنی کاپی محفوظ کرانے کے لیے مبلغ -/۱۶۰ روپے بذریعہ منی آرڈر / بنک ڈرافٹ
درج ذیل پتے پر روانہ فرمائیں۔

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

مولانا حمید الدین فراہیؒ اور حدِّ رجم

ڈاکٹر اسرار احمد

[یہ مضمون اگرچہ ماہِ جنوری کے دوران روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہو چکا ہے لیکن چونکہ وہاں بعض جملے حذف کر دیے گئے تھے جس کے باعث پوری بات سامنے نہیں آسکی تھی، لہٰذا مکمل مضمون ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے]

تقریباً سوا ماہ وطن سے باہر رہ کر واپسی ہوئی تو "نوائے وقت" کے کالموں میں حدِّ رجم کے بارے میں مولانا امین احسن اصلاحی کی منفرد اور شاذ رائے کی تائید اور جملہ فقہائے امت کے متفق علیہ موقف و مسلک پر جارحانہ تنقید پر مشتمل بحث دیکھنے میں آئی۔ اس سے قبل مولانا اصلاحی کی رائے پر بہت سے دینی جرائد میں بھی مفصل تنقید شائع ہو چکی ہے اور متعدد کتابیں بھی اس موضوع پر منصۂ شہود پر آچکی ہیں..... دوسری طرف مولانا اصلاحی کے دفاع کے ضمن میں بھی "نوائے وقت" کے کالم نگار اپنے ذاتی ماہنامے میں حقِ وکالت ادا کر چکے ہیں۔ راقم کی ذاتی رائے میں یہ بحث ایک قومی روزنامے کے صفحات کے لئے بالکل موزوں نہیں ہے۔ اور اگرچہ ع "رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند!" کے مصداق اس معاملے میں کسی کو کچھ کہنے کا حق حاصل نہیں ہے تاہم فرمانِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ و السلام کے مطابق حقِ نصح کی ادائیگی کے طور پر ادارہ "نوائے وقت" سے ادب کے ساتھ درخواست ہے کہ اس ضمن میں اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی کرے، تاکہ امت کے سوادِ اعظم کے دینی جذبات مجروح نہ ہوں اور اختلافی علمی مباحث تحقیقی اداروں کے علمی جرائد تک محدود رہیں۔

جہاں تک راقم الحروف کا تعلق ہے وہ بنیادی طور پر "فقہیات" کے میدان کا آدمی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے آج تک بھی مولانا موصوف کی رائے سے صرف اظہارِ برأت ہی پر اکتفا کی ہے..... (اور وہ بھی صرف اس لئے کہ اُس کا مولانا کے ساتھ ایک طویل

عرصے کی نیاز مندی کا تعلق بہت سے لوگوں کے علم میں ہے اور وہی مسلسل دس برس تک مولانا کی جملہ تصانیف کی نشرواشاعت کی خدمت سرانجام دیتا رہا' چنانچہ مولانا کی تفسیر "تدبّر قرآن" کا اولین ناشر بھی وہی تھا۔ بنا بریں لوگوں کو وہم ہو سکتا تھا کہ شاید راقم بھی اس معاملے میں مولانا کا ہم رائے ہے)..... اور پیش نظر تحریر میں بھی اس مسئلے سے متعلق کوئی علمی بحث مقصود نہیں ہے بلکہ اس ذاتی وضاحت اور اظہار و اعلان برأت کے ضمنی مقصد کے ساتھ اس تحریر سے اصلاً مطلوب مولانا اصلاحی کے استاذ مولانا حمید الدین فراہیؒ کے بارے میں ایک مغالطے کا ازالہ ہے۔

اب سے لگ بھگ دو اڑھائی ماہ قبل جاوید احمد صاحب نے اپنے ایک کالم میں یہ تاثر دیا تھا کہ حدِّ رجم کے بارے میں مولانا فراہیؒ کی رائے بھی بعینہٖ وہی تھی جو مولانا اصلاحی کی ہے..... حالانکہ اس سے صرف ایک ڈیڑھ ماہ قبل میں نے ایک ملاقات میں اس مسئلے کے بارے میں مولانا اصلاحی سے براہ راست سوال کیا تھا تو جو جواب مولانا نے مجھے دیا تھا اُس کی رُو سے یہ تأثر ہرگز درست نہیں ہے۔ مجھے امید تھی کہ مذکورہ تحریر مولانا اصلاحی کی نگاہ سے گزرے گی تو وہ خود اس کی مناسب وضاحت فرما دیں گے لیکن سفر سے واپسی پر معلوم ہوا کہ تا حال مولانا کی جانب سے اس بارے میں کامل سکوت رہا ہے۔ اب یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ تحریر مولانا کی نگاہوں سے گزری ہی نہ ہو..... اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے سکوتِ مصلحت آمیز اختیار کیا ہو۔ بہرحال راقم کے نزدیک یہ معاملہ بہت اہم ہے اور اس کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔

میں ذیل میں اپنا سوال اور مولانا کا جواب حتی الامکان من و عن نقل کر رہا ہوں۔ اس میں کسی لفظ کے بدل جانے کا امکان تو بہرحال موجود ہے لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ مفہوم بالکل یہی تھا..... یا کم از کم میں نے اُس وقت یہی سنا اور سمجھا تھا!

میرا پہلا سوال تھا: "مولانا! کیا رجم کے بارے میں مولانا فراہیؒ کی رائے بھی وہی تھی جو آپ کی ہے؟"

مولانا کا جواب تھا: "بھئی اس کے بارے میں مَیں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتا کہ مولانا کے مصحف میں سورۂ نور کے حاشیے میں یہ الفاظ درج تھے۔ "رجم تحت مائدہ!"

دوسرا سوال : "تو کیا اس موضوع پر اُن سے آپ کی کوئی تفصیلی گفتگو کبھی نہیں ہوئی ؟"

جواب : "نہیں! کوئی گفتگو نہیں ہوئی!"

الحمدللہ کہ مولانا اصلاحی بقید حیات ہیں اور وہ اس گفتگو کی توثیق و تصدیق بھی کر سکتے ہیں اور تردید و تغلیط بھی..... اور مؤخرالذکر صورت کو میں انشاء اللہ ان کے کذب کی بجائے اپنے خللِ سماعت اور قصورِ فہم ہی پر محمول کروں گا اور بات ہرگز جواب الجواب تک نہیں پہنچے گی..... تاہم اب چونکہ بات پبلک میں آ گئی ہے لہٰذا اس کے بارے میں سکوت ہرگز مناسب نہیں ہے..... بلکہ اس کی وضاحت اور صراحت لازم ہے..... اور اگر مولانا اصلاحی صراحت کے ساتھ شہادت دیں کہ حدِّ رجم کے بارے میں مولانا فراہیؒ کی رائے بھی بعینہٖ وہی تھی جو خود اُن کی ہے..... اور فراہی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والی کسی دوسری بزرگ شخصیت کی جانب سے اس کے بالمقابل کوئی صراحت موجود نہ ہو تو ہمیں اس مسئلے میں نہ صرف اہلِ سنّت کے جملہ مکاتب فقہ بلکہ اہلِ تسنّن اور اہلِ تشیّع سب کی متفق علیہ رائے کی مخالفت پر جو صدمہ مولانا اصلاحی کے بارے میں جھیلنا پڑا ہے وہ مولانا فراہیؒ کے بارے میں بھی برداشت کریں گے، لیکن اگر حقیقت اس کے برعکس ہے تو اس معاملے میں سکوتِ مصلحت آمیز اُس " کتمانِ شہادت " کے ذیل میں آئے گا جس پر سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۴۰ میں شدید وعید وارد ہوئی ہے!

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ مولانا اصلاحی کے مذکورہ بالا الفاظ سے اس امکان کی قطعی اور حتمی نفی نہیں ہوتی کہ مولانا فراہیؒ کی رائے بھی وہی رہی ہو جو مولانا اصلاحی کی ہے، لیکن اس سے مثبت طور پر یہ نتیجہ بھی ہرگز نہیں نکالا جا سکتا کہ مولانا فراہیؒ کی رائے فی الواقع وہی تھی۔ اس لئے کہ اس کا امکان ہی نہیں گمانِ غالب ہے کہ مولانا فراہیؒ نے رجم کے ضمن میں سورۂ مائدہ کا حوالہ صرف اس لئے دیا ہو کہ رجم ایسی شدید عبرتناک سزا (جسے اغیار و اعداء " وحشیانہ " قرار دیتے ہیں) کے مماثل اور مشابہ سزا کا ذکر وہاں موجود ہے..... جیسے کہ ترجمۃ الباب میں خود امام بخاریؒ نے کیا ہے!

اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ جب تک کوئی واضح شہادت موجود نہ ہو مولانا امین احسن اصلاحی کی کسی علمی رائے کے بارے میں نہ یہ سمجھ لینا درست ہے

کہ وہی اُن کے استاذ کا مؤقف بھی رہا ہو گا..... نہ یہ باور کر لینا صحیح ہے کہ وہ فراہیؒ مکتب فکر کی متفق علیہ رائے ہے! اس لئے کہ اولاً خود مولانا اصلاحی نے اپنی تفسیر میں اپنے استاذؒ کی بہت سی آراء سے اختلاف کیا ہے' ثانیاً فراہیؒ مکتب فکر سے متعلق بہت سے اہلِ علم مولانا کی تفسیر پر شدید اعتراضات کر رہے ہیں۔ چنانچہ مولانا فراہیؒ کے سینئر ترین شاگرد مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم کے تلمیذِ رشید مولانا جلیل احسن ندوی اصلاحی مرحوم نے تو نہ صرف یہ کہ مولانا امین احسن کی بعض آراء کو 'جہالت' تک سے تعبیر کیا ہے بلکہ ان پر شدید ذاتی اور شخصی اعتراضات بھی کئے ہیں۔ اور تفسیر "تدبّر قرآن" پر ان کی مفصّل تنقید ماہنامہ 'حیات نو' بلیریا گنج (بھارت) میں سلسلہ وار شائع ہو رہی ہے۔

بنا بریں کسی معاملے میں مولانا فراہیؒ کی اپنی تحریر یا فراہی مکتب فکر کی متفق علیہ شہادت کے بغیر مولانا فراہیؒ کی رائے کے بارے میں حتمی فیصلہ ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ اور امّت کی اجماعی آراء سے اختلاف کے معاملے میں تو قاعدہ کلیہ یہی رہے گا کہ مولانا فراہیؒ کی رائے کو امّت کے اجماعی موقف کے موافق ہی قرار دیا جائے گا' اِلّا یہ کہ کوئی صریح شہادت اس کے برعکس موجود ہو!

بہرحال اس معاملے میں مولانا اصلاحی کو اپنے مرحوم استاذ کا حق ادا کرنے میں جلدی کرنی چاہئے!

اسرار احمد عفی عنہ

۶ر جنوری ۱۹۸۸ء

بقیہ: خطابِ جمعہ

بنکاری کو نفع نقصان میں شرکت (PLS) کا نام دے دیا گیا ہے' حالانکہ وہ بھی سود کا سود ہی ہے اور اس کے اندر بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ڈالا گیا۔

وقت چونکہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا میں اس مسئلے کی تفصیل میں نہیں جا رہا۔ میرے لیے سہولت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اِس موضوع پر ایک مفصل شذرہ جنوری کے میثاق میں شائع ہو گیا ہے جو آج ہی چھپ کر آیا ہے

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ
الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

شیخ الہندؒ اور انتخابِ امام الہند

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تالیف
"جماعتِ شیخ الہند اور تنظیم اسلامی" کے مقدّمے پر

آزاد کشمیر سے مولانا محبوب الرحمٰن کا تنقیدی نوٹ

مجلّہ میثاق کا گذشتہ دو اڑھائی سال سے برابر مطالعہ کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے قلم سے زور دار مضامین اُن کے زاویہ سے بے حد مؤثر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے گذشتہ کئی مضامین میں بھی آزادیٔ ہند کی تحریک کے حوالہ سے حضرت شیخ الہند کی دینی و سیاسی خدمات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ خصوصاً جب شیخ الہند کے حوالہ سے یہ بات سب سے پہلے ہمارے مطالعہ میں آئی کہ حضرت شیخ الہند مولانا آزاد کے نظریۂ امامت سے متفق تھے اور مولانا آزاد کی امام الہند کی حیثیت سے بیعت کے لئے بھی تیار ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی زبان اور قلم سے جب یہ بات نکلی تو علماء کی صف میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی۔ اس رائے کے حق اور مخالفت میں تاریخی حوالوں سے دلائل دیئے گئے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے حوصلہ کی داد دینی چاہئے کہ موصوف ابھی تک اپنی اس رائے پر قائم ہیں۔ ملاحظہ ہو میثاق کا حالیہ شمارہ ماہ جولائی ۸۷ء میں " جماعت شیخ الہند سے تنظیم اسلامی تک " کے عنوان سے صفحہ نمبر ۱۸ کے آخری پیرا میں تحریر فرماتے ہیں۔

" عجیب بات ہے کہ اپنے انتقال کے قریب حضرت شیخ الہند نے خرقۂ خلافت ' عطا فرمایا ایک شخص کو جو نہ صرف یہ کہ ان کے تلامذہ میں سے تھا نہ حلقہ دیوبند سے تعلق رکھتا تھا۔ بلکہ علماء کے دیگر معروف حلقوں اور سلسلوں میں سے بھی کسی سے منسلک نہ تھا۔ "

" حتیٰ کہ علماء کی سی وضع قطع بھی نہ رکھتا تھا۔ بلکہ بقول خود " گلیم زہد اور ردائے رندی " دونوں کو بیک وقت زیب تن کرنے کے جرم کا مرتکب تھا۔ اور عجیب اتفاق یہ کہ اس کا نام بھی احمد تھا اگرچہ وہ مشہور یا اپنی کنیت سے ہوا یا تخلص سے یعنی ابوالکلام آزاد "

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ہاں حضرت شیخ الہند ایک آئیڈیل ہیں اور بجا طور پر حضرت شیخ الہند اس

مقام کے مستحق ہیں۔ یہ موضوع میثاق کے شمارہ فروری ۱۹۸۵ء اور جنوری ۸۶ء میں بڑی تفصیل سے آ گیا ہے۔ مجھے یہاں اس بات سے غرض نہیں کہ نظریۂ خلافت و امامت سے مراد کیا ہے۔ مولانا آزاد اس نظریہ کے محرّک کیوں تھے اور اسے کیوں ضروری سمجھتے تھے۔ مولانا آزاد نے تحریکِ ہجرت اور بیعتِ امامت میں کیا ربط تلاش کر لیا تھا۔ اور اس نظریہ کے پیش نظر فی زمانہ ڈاکٹر اسرار احمد اپنی بیعت بحیثیت امیر تنظیم اسلامی لینے میں کس حد تک حق بجانب ہیں۔ لیکن تاریخ کے حوالہ سے یہ بات جو تحریر میں آئی ہے کہ شیخ الہند مولانا آزاد کی بیعت سے متفق بلکہ مؤیّد تھے۔ اس بارہ میں معلوم کرنا ہے کہ یہ بات کس حد تک صحیح ہے۔ جس طرح دیگر حضرات نے اس بارہ میں تاریخی حوالوں سے اپنے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے اسی طرح آزادئ ہند کے موضوع پر مختلف کتابوں کے مطالعہ کے دوران راقم کو بھی چند حوالے ملے ہیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ میثاق ہی کے ذریعہ قارئین کے سامنے پیش کروں۔

تحریک آزادی ہند میں تحریکِ خلافت کو اہم حیثیت حاصل ہے۔ اس موقع پر اس تحریک کے مقاصد اور خلافت کانفرنس کے قیام وغیرہ سے ہمیں غرض نہیں البتہ اس قدر معلوم کرنا ضروری ہے کہ ہندوستان میں خلافت کمیٹی کے قیام کی غرض و غایت جنگ عظیم اول کے اختتام پر مطابق پیمان وعہد خلافت مرکزیہ اسلامیہ ترکی کو بحال رکھنا تھا۔ اور اس کے ہمراہ اماکن مقدسہ جزیرۃ العرب، بیت المقدس، فلسطین، بغداد، نجف اشرف کو خلیفہ کے زیرِ نگین رکھا جانا تھا۔ اس موقع پر لندن میں جو خلیج کانفرنس تین ممالک امریکہ، برطانیہ، فرانس پر مشتمل کام کر رہی تھی۔ اس پر مسلمانانِ ہند کی طرف سے خلافت تحریک کے ذریعہ دباؤ ڈالنا تھا۔ اس خاطر مسلمانوں کا جو وفد لندن گیا اس کا نتیجہ کیا نکلا اس کی علیحدہ داستان ہے۔ تاہم مولانا آزاد اس وفد سے بالکل بے نیاز رہے۔ چنانچہ وہ اپنی تالیف "انڈیا ونز فریڈم" میں لکھتے ہیں۔

"وفد وائسرائے سے ملا۔ جس نے عرضداشت پر تو دستخط کر دیئے۔ وفد کے ساتھ میں گیا نہیں۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ معاملات عرضداشتوں اور وفدوں کی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں۔"

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ابھی مالٹا میں اسارت کے دن گزار رہے تھے کہ اس دوران تیسری خلافت کانفرنس کے موقع پر جو فروری ۱۹۲۰ء میں ٹاؤن ہال کلکتہ میں ہوئی۔ وہاں مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک نہایت ہی جامع خطبہ خلافت کے موضوع پر دیا۔ اس کے ساتھ ہی کانفرنس کے دوسرے دن مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک منصوبہ کی بنیاد رکھی۔ جس کے بارہ میں مولانا کے مقرّب مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اپنی

کتاب "ذکرِ آزاد" میں یوں تحریر فرماتے ہیں:۔

"مولانا کی اسکیم کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو مذہب کی راہ سے منظم کیا جائے۔ مسلمانوں کا ایک امام ہو اور امام کی اطاعت کو وہ اپنا دینی فرض سمجھیں۔ مسلمانوں میں یہ دعوت مقبول ہو سکتی ہے اگر قرآن و حدیث سے انہیں بتا دیا جائے کہ امام کے بغیر ان کی زندگی غیر اسلامی ہے۔ اور ان کی موت جاہلیت پر ہوگی۔ جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد امام کو مان لے تو امام ہندوؤں سے معاہدہ کر کے انگریزوں پر جہاد کا اعلان کر دے۔ اور ہندو مسلمانوں کی متحد قوت سے انگریزوں کو شکست دے دی جائے۔ مگر امام کون ہو؟

اس منصب کے لئے زیادہ سے زیادہ معتبر آدمی کو چُننا ہو گا۔ ایسے آدمی کو جو کسی قیمت پر دشمن کے ہاتھ بِک نہ سکے۔ ساتھ ہی امام ہوشمند اور حالاتِ زمانہ سے کماحقہٗ واقف ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے مولانا اپنی ذات سے زیادہ کسے امامت کا اہل سمجھ سکتے تھے۔"

اس دوران معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے اپنے آپ کو امامت کا اہل سمجھتے ہوئے اپنی طرف سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو ماذون و مجاز قرار دیتے ہوئے انہیں اس بات کی اجازت دی کہ وہ مولانا کی نیابت میں لوگوں سے مولانا کے حق میں امام الہند کی حیثیت سے بیعت لیں مولانا ابوالکلام نے اس بات کی خاطر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو اپنا خلیفہ قرار دیا۔ جس کی عبارت حسب ذیل ہے۔

"اخیم مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے وہ بیعت لینے اور تعلیم و ارشاد و سلوک سنت میں فقیر کی جانب سے ما ذون و مجاز ہیں۔ جو طالبِ صادق اُن کے ہاتھ پر بیعت کریں گے انہوں نے خود فقیر سے بیعت کی۔ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ فقیر ابوالکلام غفراللہ لہٗ ۴ شعبان ۱۳۳۸ھ غالباً ۲۳ر اپریل ۱۹۲۰ء۔

مولانا ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام نے الفاظ بیعت کا مسوّدہ بھی لکھ دیا وہ حسب ذیل ہے۔

امنت باللّٰہ وبماجاء من عند اللّٰہ و امنت برسول اللّٰہ وبما جاء من عند رسول اللّٰہ واسلمت واقول اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ للہ رب العلمین لا شریک لہ وبذالک امرت وانا اول المسلمین○

بیعت کرتا ہوں میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بواسطہ خلفاء و تابعین کے اس بات پر کہ:

۱..... اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک کلمہ لاالٰہ الااللہ محمدرسول اللہ کے اعتقاد و عمل پر قائم رہوں گا اگر استطاعت پائی۔

۲..... پانچ وقت کی نماز قائم رکھوں گا۔ رمضان کے روزے رکھوں گا۔ زکوٰۃ اور حج ادا کروں گا۔ اگر استطاعت پائی۔

۳..... ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں نیکی کا حکم دوں گا' برائی کو روکوں گا۔ صبر کی وصیت کروں گا۔

۴..... میری دوستی ہوگی تو اللہ کی راہ میں اور دشمنی ہوگی تو اللہ کی راہ میں۔

۵..... اور بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں اپنی جان سے اپنے مال سے اپنے اہل و عیال سے دنیا کی ہر نعمت اور ہر لذت سے زیادہ اللہ کو اور اس کے رسولؐ کو اس کی شریعت کو اس کی امت کو محبوب رکھوں گا۔ اور اس کی راہ میں جو حکم کتاب اللہ و سنت کے مطابق دیا جائے گا۔ السمع و الطاعۃ کے ساتھ اس کی تعمیل کروں گا۔

مولانا آزاد کی ہدایت پر ان کے خلیفہ و نائب نے ہندوستان بھر کے مختلف صوبوں میں مولانا کی امامت کے لئے بیعت کا کام شروع کر دیا۔ مولانا آزاد نے اپنے خلیفہ کے لئے پچاس روپے ماہوار مقرر کر دیئے۔ جبکہ ایک نیک دل مسلمان نے اس کام کے لئے مولانا آزاد کو ایک خطیر رقم مہیا کر دی تھی۔ مولانا طیع آبادی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے اس نسخہ کو آزمایا اور مجرب پایا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن فروری ۱۹۲۰ء کے دوران مالٹا سے رہا ہوئے۔ اور ۸ر جون ۱۹۲۰ء کو بمبئی پہنچے۔ اس سارے عرصہ میں ہندوستان کے طول و عرض میں مولانا طیع آبادی کے توسط سے مولانا آزاد کی بحیثیت امام الہند بیعت ہو رہی تھی۔ اس موقع پر یہ ضروری نہیں سمجھا گیا کہ مولانا آزاد کی امامت کے لئے تمام مسلم حلقوں سے اتفاق حاصل کیا جائے۔ مولانا عبدالرزاق طیع آبادی لکھتے ہیں کہ۔

"اس کے بعد طے پایا گیا کہ امامت کا مسئلہ پبلک میں لانے سے پہلے اندر اندر مولانا کی امامت کے لئے ملک بھر میں بیعت لینا شروع کر دیا جائے۔ تاکہ جب یہ معاملہ سامنے آئے تو امام کی بیعت واقعہ بن چکی ہو۔ اس سے لوگوں میں رشک و رقابت کا سدباب ہو جائے گا۔ اور مسلمان ایک امام پر متفق ہو کر ہندوستان کو غلامی سے نجات دلا سکیں گے۔"

حضرت شیخ الہند ہندوستان واپسی پر لکھنؤ مولانا عبدالباری فرنگی محل کے ہاں تشریف لے گئے۔ اس لئے کہ مولانا عبدالباری فرنگی محل تحریکِ خلافت کے روح رواں تھے۔ مولانا عبدالرزاق طیع آبادی نے

اس فرصت کو غنیمت سمجھتے ہوئے لکھنؤ جا کر ہر دو شیوخ یعنی حضرت شیخ الہند اور مولانا عبدالباری فرنگی محل سے ملاقات کی اور انہیں مولانا آزاد کی بیعت بحیثیت امام الہند کے لئے راضی کرنا چاہا۔ مگر دونوں بات ٹال گئے مولانا عبدالرزاق نے مولانا عبدالباری فرنگی محل کی ایک تحریر نقل کی ہے۔ جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"مولانا محمود حسن سے دریافت کیا تو وہ بھی اس بار کے متحمل نظر نہیں آتے۔ مولانا ابوالکلام صاحب اسبق و آمادہ ہیں اُن کی امامت سے مجھے اختلاف نہیں ہے۔ بسروچشم قبول کرنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ تفریقِ جماعت کا اندیشہ نہ ہو۔ مولانا تو اہل ہیں کسی نا اہل کو اکثر اہلِ اسلام قبول کر لیں گے۔ تو وہ لوگ سب سے زیادہ اطاعت گزار فرمانبردار مجھے پائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ تحریک دیانتاً میں اپنی سمت سے جاری کرنا نہیں چاہتا نہ کسی کو منتخب کر کے اس کے اعمال کا اپنے اوپر بار لینا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کی جماعت کا تابع ہوں۔ اس سے زائد مجھے اس تحریک سے تعرض نہیں ہے۔

والسلام...... بندہ فقیر عبدالباری

مولانا آزاد نے مولانا عبدالباری کے اس خط پر یوں رائے دی۔

"یارِ ما ایں دارد وآں نیز ہم" سرِدست اس قصّہ کو تہہ کیجئے اور کام کئے جایئے۔ پنجاب 'سندھ' بنگال میں تنظیم مکمل ہے۔ مولانا آزاد اپنے خلیفہ مولانا عبدالرزاق کی کوششوں سے مطمئن نظر آتے ہیں۔ اور انہیں کام جاری رکھنے کی تاکید کرتے ہیں۔

"بہرحال ہمارا دائرہ عمل مکمل ہو چکا ہے۔ پنجاب' سندھ و بنگال متحد و متفق ہیں اور اب پوری تیزی سے کام جاری ہو گیا ہے۔ ان لوگوں مولانا عبدالباری' مولانا محمود حسن اور مولانا حسرت موہانی کے فیصلہ کا انتظار بے سود تھا۔ اور بے سود ہے۔"

مولانا آزاد کی تحریک کا انجام کیا ہوا۔ اس بات کو معلوم کرنے کے لئے علی برادران اور تحریکِ خلافت سے اُن کی وابستگی کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس دور میں تحریکِ خلافت جو زور و شور سے جاری تھی۔ اور مولانا محمد علی جوہر ایک وفد کے ہمراہ لندن گئے تھے۔ مولانا محمد علی بات کے بڑے پکے تھے۔ جو بات زبان پر آتی اسے کر گزرنے میں انہیں باک نہ تھا۔ دوسرے کی طرف سے اپنی ذات پر تنقید گوارہ نہیں کرتے تھے۔ جس کے پیچھے پڑتے اُس کو جان بچانا مشکل ہو جاتا۔ مولانا ظفر علی خان جو تحریکِ خلافت میں پیش پیش رہے۔ اُن سے اَن بَن ہوئی تو غدّار تک کہہ دیا۔ دلّی کے سجّادہ نشین اردو

ادب کے مشہور ادیب خواجہ حسن نظامی کے پیچھے پڑ گئے تو زبان و قلم سے لڑائی شروع ہو گئی۔ اس لڑائی نے دینی، ادبی اور سیاسی حلقوں میں اضطراب پیدا کر دیا۔ مولانا محمد علی نے خواجہ حسن نظامی کو "ختم خواجگی" کی دھمکی دے دی۔

مولانا محمد علی کی اس طوفانی طبیعت سے مولانا آزاد پوری طرح واقف تھے۔ وہ ہرگز مولانا محمد علی سے تصادم مول لینے کے لئے تیار نہ تھے۔ مولانا محمد علی کی لندن سے واپسی ۱۹۲۰ء کے آخر میں ہوئی۔ اس سے قبل ہی مولانا آزاد نے اپنی امامت کے مسئلہ سے دستبردار ہونے میں عافیت سمجھی۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے:

"لیکن مولانا محمد علی نہایت مستعد لیڈر تھے اور طوفانی طبیعت رکھتے تھے۔ ان کا اثر بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اور مولانا کی امامت ہی کے سبب خود مولانا کی ذات سے سخت مخالف تھے۔ دونوں میں عمر بھر رقابت رہی۔ قدرتی طور پر مولانا نے جواز حد معاملہ فہم اور ٹھنڈی طبیعت کے آدمی تھے محسوس کر لیا کہ علی برادران سے تصادم مسلمانوں میں پھوٹ ڈال دے گا۔ مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی انہی برادران کے ساتھ تھا۔ پھر فرنگی محل بھی مخالف تھا۔ گو کہ شیخ الہند کی طرف سے مخالفت نہ تھی مگر دیوبند کا طاقتور حلقہ بھی مولانا کا طرفدار نہ تھا۔ اس صورت میں مسئلہ امامت کا آخر تک پہنچانا دانشمندی کے خلاف تھا۔ ان حالات میں مولانا آزاد کی امامت کی تحریک ستمبر ۱۹۲۰ء میں ختم ہو گئی۔

یہ ہے مولانا آزاد کے امام الہند بننے کی ساری داستان۔ اس اجمالی تعارف سے واضح ہو گیا ہے کہ انہوں نے تحریک خلافت کے دوران علی برادران جن سے اُن کی رقابت چلی آ رہی تھی۔ ان سے الگ مذہب کی راہ سے مسلمانوں کو سیاست میں لانے کے لئے اپنی امامت کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریہ کو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مولانا آزاد کے خلیفہ و ماذون کی حیثیت سے مسلمانوں سے امام الہند کے نام پر بیعت لیتے رہے۔ شیخ الہند کی مالٹا کی اسارت سے رہائی کے بعد ہندوستان میں آمد پر لکھنؤ میں مولانا عبدالباری فرنگی محل کے ہاں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ملاقات کے دوران ہر دو شیوخ نے مولانا آزاد کے امام الہند نظریہ سے اتفاق نہیں کیا۔ جس سے مولانا آزاد کو ایک طرح کا افسوس بھی رہا۔ پھر ستمبر ۱۹۲۰ء میں نظریۂ امامتِ ہند از خود دم توڑ گیا۔ قاضی محمد عدیل عباسی اپنی کتاب تحریک خلافت میں رقم طراز ہیں:۔

"امامتِ ہند کی تحریک بے سود ہی رہی۔ اور پھر تمام عمر مولانا آزاد نے اس اہم فریضۂ مذہبی کا کبھی

ذکر ہی نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرعی مسئلہ دریائے گنگ وجمن کی لہروں کی نذر ہو گیا۔ اور مولانا کو دیگر مشاغل نے ادھر توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ دی کہ وہ تمام مسلمانان ہند کو "جاہلیت" اور "معصیت" کی زندگی گزارنے کے خلاف آمادہ کرنے کی جدوجہد کریں حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ تحریکِ خلافت نے وہ کام براہ راست کر دیا جو تحریکِ امامت سے بالواسطہ مولانا کرانا چاہتے تھے۔ اور اسی لئے مولانا نے خاموشی اختیار کر لی۔"

ہمیں اس سے غرض نہیں کہ ڈاکٹر اسرار احمد اپنی تحریک تنظیم اسلامی جس کی بنیاد اسی نظریۂ امامت پر ہے۔ جس کا سرا وہ حضرت شیخ الہند سے جوڑتے ہیں بالآخر وہ اپنے عقیدت مندوں کے لشکر سے کس کے خلاف اعلانِ جہاد کرنے والے ہیں۔ اوپر کے تاریخی حوالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امامتِ ہند کا نظریہ دراصل مولانا آزاد کا اپنا اختراع کردہ تھا۔ وہ اپنے تئیں امام الہند بننے کے خواہشمند تھے۔ تاکہ امام کے مرتبہ پر فائز ہو کر اپنے عقیدت مندوں کے لشکر سے ہندوؤں کو ساتھ ملا کر انگریزوں کے خلاف اعلانِ جہاد کریں۔ بالآخر یہ نظریہ چھ سات ماہ زندہ رہ کر خود ہی ستمبر ۱۹۲۰ء میں ختم ہو گیا۔

فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ

تبصرہ از مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی مدظلہ

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مولانا ابوالکلام آزادؒ کے بارے میں امارت اور امامت کی بحث چھیڑ کر اس مسئلہ کے ان پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے جو اب تک پردۂ خفاء میں تھے اس سلسلہ میں یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے جب مولانا آزاد کی امارت کا مسئلہ پیش ہوا تو آپ نے اس سے اتفاق کیا۔

شیخ الہند کے نزدیک مولانا آزاد کی آواز ہی وہ صدائے حق تھی جس نے امّت کو نیند سے بیدار کیا۔ شیخ الہند نے مالٹا کی اسارت کے زمانہ میں اس امت کے زوال کے دو سبب دریافت فرمائے 'ایک امت کا باہمی اختلاف اور دوسرا کتاب اللہ سے دوری اور پھر آپ نے یہ دونوں کام شروع کر دیئے۔

جہاں تک دعوت قرآن کا تعلق ہے مولانا آزاد یہ کام شروع کر چکے تھے اور الہلال و البلاغ کی دعوت کا مقصد مسلمانوں کو براہ راست قرآن کریم سے وابستہ کر کے ان کے اندر اتباعِ شریعت کی اسپرٹ پیدا کرنا تھا۔

جہاں تک اتحادِ امّت کا معاملہ ہے' اس کی جائز حد یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہؐ کے دائرہ میں رہتے ہوئے امّت میں فقہی مسائل کے اندر جو اختلاف ہے اس کی شدت ختم ہو جائے اور ہر فقہی مسلک کو حق سمجھا جائے' مولانا آزاد نے اس ضروری اتحاد کے سلسلہ میں بھی جدوجہد شروع کر دی تھی' چنانچہ مولانا آزاد دین کے اندر بدعات وزوائد کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے حالانکہ مولانا کے والد اسی مسلک کے بڑے متشدّد شیخ و پیر تھے لیکن مروّجہ فقہی تقلید کے معاملے میں مولانا کا مسلک شاہ ولی اللہؒ کے مطابق فقہی توسع پر مبنی تھا۔

حضرت شیخ الہند کے یہ تاثرات بھی تاریخ کا ناقابل تاویل حصہ ہیں کہ حضرت شیخ کو اپنے مشن کے سلسلہ میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ قدیم طبقہ سے نہیں تھیں' اسی جذبہ کے تحت شیخ الہند نے علی گڑھ تحریک سے قریبی تعلق قائم کیا اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ ان احساسات کی روشنی میں مولانا آزاد کی امارت کے بارے میں حضرت شیخ کا خیال کسی بحث کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

یہ بات صرف ایک فرضی تخیل کے سوا کچھ نہیں کہ امارت کا شرعی مسئلہ دریائے گنگ و جمن کی لہروں کی نذر ہو گیا اور مولانا آزاد کو دیگر مشاغل نے ادھر توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ دی کہ وہ تمام مسلمانان ہند کو جاہلیت اور معصیت کی زندگی گذارنے کے خلاف آمادہ کرنے کی جدوجہد کریں (تحریک خلافت ص ۱۳۰)

مولانا آزاد کے اندر مسلمانوں کی شرعی تنظیم کے لئے ایک امیر و امام کے تقرر کا جوش و جذبہ کیوں پیدا ہوا'؟..... اس کا تعلق تحریکِ خلافت کے جوش و جذبہ سے ہے۔

کلکتہ خلافت کانفرنس میں مولانا نے جو خطبہ دیا اس کے مباحث پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا نے ترکی خلافت کے تحفظ کی جدوجہد میں ایک اصول کے تحت حصہ لیا'

انگریزوں کے خلاف ایک منفی جذبہ اس کا محرک نہیں تھا' یہ جذبہ حب علیؓ پر مبنی تھا' بغض معاویہؓ پر نہیں..... اس اصول کا تقاضا تھا کہ خلافتِ عثمانیہ کی حفاظت کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی شرعی تنظیم اور اس کے لئے ایک امام وامیر کے نصب کے مسئلہ پر بھی توجہ کی جائے اور یہ مسئلہ ایک مرکزی امیر کے ہوتے ہوئے علاقائی امیر کے نصب کا مسئلہ تھا۔

مولانا کی فراست بھانپ رہی تھی کہ عالمی حالات ایسے ہیں کہ خلافتِ عثمانیہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ پھر اگر خلافت کے سقوط کا حادثہ رونما ہو جائے تو ہندوستانی مسلمانوں کی حد تک ہندوستان کے مذہبی رہنماؤں کی یہ ذمہ داری ہے کہ یہاں شرعی تنظیم اور امارت قائم ہو اور مسلمان ذہنی انتشار اور مایوسی سے بھی محفوظ رہیں۔ لیکن مذہبی قائدین کے اختلاف نے مولانا کی اس تجویز کو چلنے نہیں دیا اور صرف دو سال کے بعد خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کا حادثہ بھی رونما ہو گیا۔

مولانا آزاد نے اپنی اعتدال پسندانہ طبیعت و خیال کے تحت محتاط روش اختیار کر لی۔ امارت کے مسئلہ میں بھی محتاط ہو گئے اور جب خلافت کے سقوط پر جذباتی لیڈروں کی طرف سے واویلا شروع ہوا تو خلافت کے مسئلہ پر پرجوش خطبہ دینے والا خلافت کی جگہ جمہوری حکومت کے قیام کی توجیہات کرنے لگا اور امت کو مایوسی سے بچانے میں مشغول ہو گیا' خلافت کا سقوط جن ہاتھوں سے ہوا انہیں گمراہ قرار دیتے ہوئے مولانا نے صرف اتنی بات کہی کہ خلافت کا نظام صحیح نہیں رہا ہے اور اس لئے تمام عالم کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح کی کوشش کرے (۲۵۶) مولانا محمد علی صاحب کا گروپ عثمانی خلافت کے بعد سلطان عبدالعزیز کو خلیفہ بنانے کی توقع کرنے لگا اور پھر اس سے بھی مایوس ہو گیا لیکن مولانا کی دور اندیشی کامیاب رہی' مولانا اس تحریک سے بالکل الگ رہے اور یہ گروہ بالآخر اس درجہ ناکام و مایوس ہوا کہ لکھنؤ کی آخری خلافت کانفرنس (۱۹۲۷ء) کے صدرِ استقبالیہ مولانا دریا آبادی مرحوم کے الفاظ میں' "ایک خواب شیریں تھا جسے دیکھنے کے بعد مسلمان عرصہ ہوا اسے بھی بھلا چکے تھے"۔

اسی کانفرنس میں مسلم زعماء نے مسلمانانِ ہند کو تعلیمی اور معاشرتی تعمیر کے کاموں میں لگنے کا مشورہ دیا اور اس راہ میں تمام مسلم اور غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کی دعوت

دی (۲۶۷) مولانا آزاد اس فیصلہ سے بہت پہلے اپنے آپ کو اسی راہ پر ڈال چکے تھے جس کا فیصلہ حکیم اجمل خاں صاحب کی صدارت میں آخری خلافت کانفرنس نے کیا تھا۔ مولانا آزاد آزادئ ہند کی تحریک میں مشغول ہو گئے' قید و بند کے مصائب نے مولانا کو گھیر لیا لیکن مولانا کے دل میں مسلمانانِ ہند کی شرعی تنظیم سے محروم زندگی کا احساس کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا۔

جمعیتِ علماء ہند کے ریکارڈ میں یہ بات موجود ہے کہ جمعیتِ علماء کے جلسہ میں جب مولانا آزاد کی امارت اور بیعت کا مسئلہ زیر بحث آیا تو مولانا معین الدین صاحب اجمیری نے سب سے پہلے اس مسئلہ میں ایک اصولی بحث چھیڑ دی اور ہنگامی بیعت کی نوعیت پر روشنی ڈال کر مسئلہ کو ختم کر دیا' سوال بڑا علمی اور فقہی تھا' اس لئے دوسرے اکابرِ علم کے اندر بھی اختلاف کا جوش پیدا ہو گیا اور مولانا اجمیری کی تائید کی گئی' یہ کس تاریخ کی بات ہے' اس کا حوالہ یہاں میرے پاس نہیں ہے' اس کے بعد مولانا آزاد اپنی امارت کے معاملے میں محتاط ہو گئے لیکن اصل مسئلہ کی طرف سے مولانا کا دماغ بے فکر نہیں رہا۔

رانچی کے قیام میں علماء بہار کو اس طرف توجہ دلائی اور مولانا کے رفیقِ خاص مولانا ابوالمحاسن سجادؒ نے صوبہ بہار میں امارتِ شرعیہ کا نظام قائم کر دیا۔ مولانا انور شاہ صاحب محدث ہند نے پنجاب میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو امیرِ شریعت کا خطاب دے کر اس وقت کے اہم ترین دینی مسئلہ یعنی ختم نبوت کے عقیدہ کی حفاظت کے محاذ کو قوت پہنچائی۔

۱۹۳۵ء میں مولانا آزاد نے ترجمان القرآن تحریر فرمائی اور زکوٰۃ کی شرعی تنظیم (بیت المال) کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے امیر و امام کے نصب کی ضرورت کا اظہار کیا۔ سورۂ توبہ کی آیت اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ .....الخ" کی تفسیر میں یہ مسئلہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس وقت تک بھی مولانا امام کے نصب کی شرعی اہمیت سے غافل نظر نہیں آتے' ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے امارت کے مسئلہ سے دلچسپی لے کر ایسا کوئی گناہ نہیں کیا کہ لوگ ڈاکٹر صاحب پر ناراض ہوں۔ ایک بزرگ نے اپنے مراسلہ میں لکھا ہے۔

"ہمیں اس سے غرض نہیں کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنی تحریک تنظیم اسلامی جس کی بنیاد اسی نظریہ امامت پر ہے جس کا سرا وہ حضرت شیخ الہند سے جوڑتے ہیں بالآخر وہ اپنے عقیدت

مندوں کے لشکر سے کس کے خلاف اعلانِ جہاد کرنے والے ہیں"۔

دلی والوں کے محاورہ میں اس اندازِ تحریر کو پھکڑپنا کہا جاتا ہے' بڑے ادب سے ان بزرگوں کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ امارت وامام کا مسئلہ دین کا ایک سنجیدہ مسئلہ ہے۔ اس کا تعلق کسی کے خلاف جنگ وجہاد برپا کرنے سے نہیں ہے یہ شرعی اور دعوتی تنظیم کا مسئلہ ہے' تنظیم اسلامی کے قیام کی غرض وغایت کی تفصیلات پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جماعتِ اسلامی کے پاکستانی سیاست میں کود پڑنے سے معاشرہ کی اجتماعی تربیت کا جو محاذ ختم ہو گیا تھا ڈاکٹر صاحب اس خلاء کو پر کرنے کی ضرورت سمجھتے ہیں"۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک تنظیم قائم کی وہ اس راہ میں رفاقت کرنے والے حضرات سے وہ رفاقت اور شرعی اطاعت کا عہد وپیماں لیتے ہیں' ممبری کے فارم پر کرنا' یہ جدید طریقہ ہے بیعت کے ذریعہ عہد وقرار مسنون طریقہ ہے' اب وہ اتفاق نہ کرنے والے مسلمانوں کے خلاف نہ تو جاہلیت کی موت مرنے کا فتویٰ لگاتے ہیں اور نہ پاکستانی اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوئی سازش تیار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے خلاف محاذ آرائی کے لئے اہلِ بدعت کو چھوڑ دینا چاہئے' جو حضرات عقیدہ سلف صالحین سے وابستہ ہیں ان کے لئے ڈاکٹر صاحب کی حوصلہ افزائی جس حد تک بھی ہو سکے نہایت ضروری ہے اس مادّہ پرستانہ تہذیب کے عروج وشباب کے دور میں نظامِ حق کے قیام ونفاذ کی ہر جدوجہد قابلِ قدر ہے' اسے نقصان پہنچانا آخرت کی باز پرس کا سودا ہے امیر وامام اور بیعت کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے خیالات سے اختلاف کرنے میں بھی اس کا لحاظ رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے اصل کام کو نقصان نہ پہنچے۔

اخلاق حسین قاسمی دہلوی مہتمم واستاذ تفسیر جامعہ رحیمیہ شاہ ولی اللہ" دہلی مقیم اچھرہ لاہور

۳ جنوری ۱۹۸۸ء

●●●●

عَنِ الحَارِثِ الاشعَرِی، قَالَ، قَالَ رَسُولُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ
"اٰمُرُکُم بِخَمسٍ
بِالجَمَاعَۃِ وَالسَّمعِ وَالطَّاعَۃِ وَالھِجرَۃِ وَالجِھَادِ فِی سَبِیلِ اللہِ"
(مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسند احمد وجامع ترمذی)

بیسویں صدی عیسوی

میں صنم کدۂ ہند میں "احیائے اسلام" کی کوششوں پر ایک اہم تاریخی دستاویز

جماعتِ شیخ الہندؒ اور تنظیمِ اسلامی

- ابو الکلامؒ امام الہند کیوں نہ بن سکے — ؟
- "حزب اللہ" اور "دارالارشاد" قائم کرنے کے منصوبے بنانے والا "عبقریٔ وقت" کانگرس کی نذر کیوں ہو گیا!
- احیائے دین اور احیائے علم کی تحریکوں سے علماء کی بدظنی کیوں ؟
- کیا "اقامتِ دین" کی جدوجہد ہمارے دینی فرائض میں شامل ہے !
- حضرت شیخ الہندؒ کیا کیا حسرتیں لے کر اس دنیا سے رخصت ہوئے ؟
- علمائے کرام اب بھی 'متحد' ہو جائیں تو

'اسلامی انقلاب' کی منزل دُور نہیں !

٭ فرائض دینی کا جامع تصور ٭ رجم ٭ عورت کی دیت اور دیگر مسائل پر

ڈاکٹر اسرار احمد کی معرکتہ الآرا تحریروں اور خطبات کے علاوہ مورخِ اسلام مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری، مولانا افتخار احمد فریدی، مہاجر کابل قاری حمید انصاری، پروفیسر محمد اسلم، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی، مولانا محمد زکریا، مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری اور دیگر نامور علمائے کرام اور اہلِ علم حضرات کی تحریروں پر مشتمل تاریخی مرقع

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے مبسوط مقدمے کے ساتھ

• ضخامت ۴۵۶ صفحات (نیوز پرنٹ) • قیمت -/۴۰ روپے

'میثاق' اور 'حکمتِ قرآن' کے مستقل خریداروں کو یہ کتاب ۲۵ فیصد رعایت پر مبلغ -/۳۰ روپے بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک پیش کی جائے گی ۔ ڈاک خرچ ادارے کے ذمے ہو گا ۔

نوٹ : کتاب چھپ کر آ گئی ہے ۔ کراچی کے خریداران 'میثاق' و 'حکمتِ قرآن' یہ کتاب کراچی آفس (۱۱ ، داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت) سے بارعایت حاصل کر سکتے ہیں۔

ملنے کا پتہ :

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

سات ہفتے وطن سے باہر

امیرِ تنظیم اسلامی کے حالیہ دورہ ابوظہبی، لندن اور سعودی عرب کی رُوداد

مرتب: قمر سعید قریشی

کئی ماہ سے ابوظہبی کے رفقاء کا شدید تقاضا تھا کہ امیرِ تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد ابوظہبی کے دعوتی دَورے کا پروگرام بنائیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ قریباً ایک سال پہلے امیرِ محترم کو ابوظہبی میں پہلی بار اپنی دعوتِ قرآنی اور انقلابی فکر پہنچانے کا موقع ملا تھا۔ وہ دَورہ الحمدللہ بہت بھرپور اور کامیاب رہا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں وہاں فوراً ہی تنظیم اسلامی کی ایک باقاعدہ شاخ کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا۔ ابوظہبی کے رفقاء کی فعالیت اور وہاں کام کے انداز اور اس کی رفتار کو دیکھتے ہوئے امیرِ تنظیم اسلامی کے لیے رفقاء کے مطالبے کو ٹالنا ممکن نہ تھا۔ اسی دَوران لندن سے طٰہٰ پبلشرز کے جناب افسر صدیقی صاحب کی شدید خواہش بھی سامنے آئی کہ لندن میں ابھی تک چونکہ امیرِ تنظیم اسلامی کا کوئی باقاعدہ دعوتی پروگرام نہیں ہوا ہے لہٰذا امیرِ تنظیم کا کوئی بھرپور پروگرام لندن میں بھی رکھا جائے۔ چنانچہ ابوظہبی کے لیے ۱۸ تا ۲۶ نومبر اور لندن کے لیے ۴ تا ۱۱ دسمبر کی تاریخوں کا تعین کر لیا گیا۔ سفر کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں کہ اچانک ۱۶ نومبر کو ابوظہبی سے اس اطلاع کی آمد پر کہ حکومت ابوظہبی کی جانب سے ابوظہبی کے پاکستان سنٹر میں پروگرام کی اجازت نہیں مل سکی ہے، پروگرام کچھ کھٹائی میں پڑتا ہوا دکھائی دیا۔ ۱۷ نومبر کا دن اسی غیر یقینی کیفیت میں گزر گیا۔ امیرِ محترم کی طبیعت بھی سفر پر آمادہ نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے اسے اللہ کی جانب سے تائیدی رکاوٹ قرار دیا۔ مگر رات ۹ بجے ابوظہبی سے برادر محترم نسیم الدین صاحب نے اس توقع کا اظہار کرتے ہوئے کہ اجازت مل جائے گی، اصرار کیا کہ امیرِ محترم ضرور تشریف لائیں۔ رفیقِ محترم جناب قمر سعید قریشی صاحب حسبِ سابق اس سفر میں امیرِ تنظیم کے ساتھ تھے۔ ان کی مرتب کردہ رپورٹ ایک خلاصے کی شکل میں پیشِ خدمت ہے۔

(ادارہ)

۱۸۔ نومبر کی صبح قرآن اکیڈمی سے روانگی ہوئی۔ فلائٹ نصف گھنٹہ تاخیر سے دوبئی کے لئے روانہ ہوئی اور ہم مقامی وقت کے مطابق سوا گیارہ بجے صبح بخیر وعافیت دوبئی پہنچ گئے ہمیں بتایا گیا تھا کہ ویزے کا اہتمام وہیں ایئرپورٹ پر کر دیا جائے گا چنانچہ لاؤنج میں پی آئی اے کے سٹیشن منیجر امیر محترم کے ویزے کے ساتھ موجود تھے۔ مگر ساتھ ہی انہوں نے یہ پریشان کن خبر سنادی کہ راقم الحروف کا ویزا تا حال نہیں پہنچا۔ امیرِ محترم کے لئے چونکہ کوئی رکاوٹ نہیں تھی لہٰذا کاغذی کارروائی سے فراغت کے بعد وہ باہر منتظر رفقاء کے پاس تشریف لے گئے۔ مقامی رفقاء شیشے کی دیوار کے پار سے اشاروں کی زبان میں راقم کا حوصلہ بڑھا رہے تھے لیکن ویزے کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ تقریباً گھنٹہ بھر کے بعد برادرم نسیم الدین صاحب نے مقامی حالات کو پیش نظر رکھ کر راقم کے لئے لندن روانگی کا اہتمام شروع کیا ہی تھا کہ ایک شرطہ (سپاہی قسم کا ملازم) یہ نوید لایا کہ راقم کا ویزا کاغذات میں سے مل گیا۔ اُن مقامی احباب سے جو استقبال کے لئے تشریف لائے تھے ملاقات کے بعد اجازت چاہی اور برادرم نسیم الدین صاحب، و عزیزان سرفراز چیمہ صاحب، خالد صاحب کے ہمراہ بذریعہ کار ابوظہبی روانہ ہوئے ڈھائی بجے ابوظہبی پہنچ کر مطعم العرب میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ اور مرکز جمعیت خدام القرآن ابوظہبی آ گئے جہاں مقامی رفقاء سراپا انتظار تھے۔ یاد رہے کہ ابوظہبی میں ہمارے رفقاء نے دفتر کے لئے باقاعدہ ایک فلیٹ حاصل کیا ہوا ہے۔ جہاں انجمن اور تنظیم کا بنیادی لٹریچر اور امیر تنظیم کے دروس و خطبات کے آڈیو اور وڈیو کیسٹوں کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ دینی موضوعات پر عمدہ کتب کی ایک منظم لائبریری کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ یہ دفتر انجمن اور تنظیم کی سرگرمیوں کا اہم مرکز ہے۔ نماز عصر ادا کرنے کے بعد پروگرام کے بارے میں تبادلہ خیال ہوا۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہال میں پروگرام کی اجازت تا حال نہیں مل سکی ہے لیکن توقع ہے کہ کل تک اجازت مل جائے گی۔ رات محترم سراج الحق سید صاحب امیر تنظیم اسلامی سندھ جو کہ عمرہ کے لئے سعودی عرب تشریف لے گئے تھے اور سعودی عرب کے متعدد رفقاء بھی حسب پروگرام ابوظہبی پہنچ گئے۔ رات گئے تک مقامی رفقاء اور احباب سے ملاقات و گفتگو رہی۔

۱۹ر نومبر۔ راقم حسب عادت علی الصبح سیر کو نکل گیا۔ وقت کا صحیح اندازہ نہ رہا اور واپسی میں کافی دیر ہو گئی جس کے باعث کافی خجالت کی سی کیفیت کا سامنا کرنا پڑا کہ مقامی رفقاء بہت پریشان تھے۔ صبح سے پروگرام کے اجازت نامہ کا انتظار با جماعت جاری تھا کہ دوپہر کے وقت حتمی انکار کی اطلاع موصول ہو گئی۔ مایوسی اور بددلی کے اثرات رفقاء کے چہروں پر نمایاں تھے خصوصاً مقامی امیر برادرم نسیم الدین صاحب بہت دل شکستہ نظر آ رہے تھے۔ تازہ صورتِ حال پر غور کے لئے امیرِ محترم نے مقامی مشاورت کا اجلاس بعد نماز عصر طلب فرمالیا۔ مغرب تک رفقاء نے اظہار خیال کیا وہ مایوسی اور بددلی جو ابھی تک چہروں پر تھی اسے اب گویا زبان مل گئی تھی۔ نمازِ مغرب کے بعد امیرِ محترم نے خطاب فرمایا اور رفقاء کی ہمت بندھاتے ہوئے اور متبادل پروگرام کے بارے میں غور وفکر کی دعوت دی تو ماحول میں بہتری کے آثار پیدا ہوئے۔ چنانچہ ۲۲ نومبر کو دوبئی اور ۲۳ نومبر کو شارجہ کے لئے پروگرام طے پا گئے۔ اور اگلے روز یعنی ۲۰ نومبر کو ابوظہبی کے رفقاء کے لئے پورے دن کی ورکشاپ کا فیصلہ ہو گیا۔

۲۰ نومبر۔ صبح کی سیر سے قبل راقم برادرم نسیم الدین صاحب کے ہاں حاضر ہوا۔ وہ مرد درویش ابھی

مصلّے پر بیٹھا تلاوت کی تیاری میں تھا۔ گزشتہ روز کی مایوسی اب ایک نئے عزم میں بدل چکی تھی۔ راقم کو بطور راز بتایا کہ "۲۲ نومبر یعنی صرف ایک دن کے پروگرام کی اجازت کے لئے درخواست دے رہا ہوں" اور پھر ایک عجیب سی کیفیت میں یہ الفاظ ان کی زبان پر آئے کہ "دل نہیں مانتا کہ وہ لوگ مجھے ایک دن کے لئے بھی انکار کر دیں گے۔" صبح ساڑھے آٹھ بجے حسب پروگرام ورکشاپ کا آغاز ہو گیا جو رات سوا گیارہ بجے تک جاری رہا۔ نمازِ جمعہ پاکستان مرکز میں ادا کی۔ شام کو کیپٹن شکیل امیرِ محترم سے ملاقات کے لئے تشریف لے آئے۔ موصوف پاکستان ایئر فورس میں سکواڈرن لیڈر کے منصب پر تھے۔ آج کل ابوظہبی ڈیفنس سے منسلک ہیں 'میثاق' کے پرانے قاری اور ابوظہبی میں ہمارے حلقۂ احباب میں شامل ہیں۔

۲۱ نومبر۔ صبح ہی سے برادرم نسیم الدین صاحب حسب ارادہ اپنے خفیہ پروجیکٹ میں مصروف ہو گئے۔ قریباً ساڑھے گیارہ بجے موصوف نے یہ خوشخبری سنائی کہ اتوار یعنی ۲۲ نومبر کو پروگرام کے لئے اجازت مل گئی ہے۔ اس موقع پر رفقاء کے جذبات کی جو کیفیت تھی اس کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں۔ وہی رفقاء جو کل تک مایوسی کی تصویر بنے ہوئے تھے آج محسوس ہوتا تھا کہ ان کے اعصاب میں بجلی بھر گئی ہے۔ یہاں تک کہ راقم جیسا غیر کارکن شخص بھی کافی دیر تک اکڑوں بیٹھ کر پوسٹرز وغیرہ کی درستگی میں لگا رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ فارغ ہو کر کمرے سیدھا ہونے سے انکار کر دیا۔ اور ساتھ ہی ٹانگ کا بھولا ہوا درد بھی عود کر آیا۔ نماز عصر تک نئے موضوع اور پروگرام کے مطابق پوسٹر تیار تھے۔ اخبارات میں اشتہارات اور مساجد میں اعلانات کے مسوّدے بھی تیار ہو چکے تھے۔ رفقاء پیدل' موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں پر پبلسٹی کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ رات نو بجے تک یہ ہنگامی پروجیکٹ مکمل ہو چکا تھا۔ ساڑھے نو بجے اجتماعی کھانا ہوا۔ جس کے بعد امیر محترم نے رفقاء سے خطاب فرمایا اور نظم کی اہمیت کے بارے میں رفقاء کو توجّہ دلائی۔ امیر محترم کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ کچھ جوشیلے رفقاء کا مقامی امیر کے ساتھ طرزِ عمل تنظیم کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہے۔ امیر محترم نے غزوۂ احد کے حوالے سے بتایا کہ امیر کی معصیت کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے فتح کو وقتی شکست میں بدل دیا تھا تاکہ اس معاملے کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے اور آئندہ ایسی غلطی کا اعادہ نہ ہو۔ بعد میں محترم امیر نے رفقاء کے جوش وجذبہ اور لگن کی تعریف فرمائی کہ جس انداز میں ابوظہبی کے رفقاء نے کام کیا ہے وہ بلاشبہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ گفتگو سوا دس بجے رات سے ساڑھے گیارہ بجے تک جاری رہی آج کی بے پناہ مصروفیت کا اثر امیرِ محترم کی طبیعت پر نمایاں طور پر محسوس ہو رہا تھا۔

۲۲ نومبر۔ الحمدللہ کہ امیرِ محترم کی طبیعت بہتر تھی۔ صبح کے اوقات میں راقم محترم عبدالباری شاہد صاحب کے دفتر میں ملاقات کے لئے گیا۔ موصوف نے اپنی مصروفیات منسوخ کر کے راقم کو وقت دیا جس کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں۔ رجوع الی القرآن کے پلیٹ فارم پر لوگوں کو اکٹھا کرنے کے موضوع پر کھل کر گفتگو ہوئی۔ دوپہر کو برادرم نسیم الدین صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ پورے پروگرام کی اجازت مل گئی ہے مگر دوبئی اور شارجہ کے پروگرام بھی چونکہ طے ہو چکے ہیں' لہٰذا ابوظہبی میں مزید صرف دو دن پروگرام رکھا جا سکتا ہے..... اسی شام لندن سے محترم افسر صدیقی صاحب کا فون بھی آیا۔

لندن میں پروگرام کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ رات بعد نماز عشاء پاکستان مرکز میں وہ پروگرام تھا جس کے لئے یہ تمام بھاگ دوڑ کی گئی تھی۔ دو سال پہلے کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ پورے علاقہ میں میلہ کا سا سماں تھا۔ اس کے باوجود کہ وقت کی کمی کے باعث مناسب تشہیر نہیں ہو سکی تھی حاضری لگ بھگ دو ہزار تھی۔ دورانِ پروگرام ہی سعودی عرب سے ایک دوست محترم قاری عبدالباسط صاحب بھی تشریف لے آئے۔ موصوف صوبہ سرحد کے دینی گھرانے کے چشم وچراغ ہیں۔ بریدہ میں ریاض یونیورسٹی کی طرف سے بطور استاد متعین ہیں۔ نہایت منکسر المزاج 'صالح اور ذہین ولائق نوجوان ہیں۔ ایک عرصہ سے سعودی عرب میں مقیم رفقاء تنظیم سے رابطہ تھا مگر چند اشکالات کے باعث تنظیم میں باقاعدہ شمولیت ابھی نہیں ہوئی تھی۔ امیر محترم نے اسی غرض سے انہیں ابوظہبی میں ملاقات کی دعوت دی تھی۔ اب الحمدللہ ہمارے قافلہ میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ خدمتِ دین کے کام میں تنظیم اسلامی کے لئے ایک اہم ستون ثابت ہوں۔ (آمین) پاکستان مرکز میں پروگرام الحمدللہ بہت بھرپور رہا۔ بعد میں کیپٹن شکیل صاحب کے ہاں پُرتکلف دعوتِ عشائیہ تھی۔ جہاں سے رات ساڑھے بارہ بجے فراغت ہوئی۔

۲۳ نومبر۔ صبح امیر محترم کا زیادہ وقت محترم قاری عبدالباسط صاحب سے گفتگو میں گذرا بعض دیگر حضرات بھی ملاقات کے لئے آئے۔ دوبئی سے محترم عبدالسلام صاحب کا فون پروگرام کو کنفرم کرنے کی غرض سے آگیا تھا۔ بعد نماز عصر چار گاڑیوں پر مشتمل قافلہ دوبئی روانہ ہوا۔ جہاں ایک مقامی ہوٹل میں قیام تھا۔ رات ساڑھے آٹھ بجے دوبئی سوسائٹی ہال میں پروگرام کا آغاز ہوا۔ موضوع تھا "سیرت النبیؐ کے عملی پہلو"۔ دوبئی کے رفقاء بڑی سرگرمی سے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مصروف تھے۔ تقریباً ایک ہزار افراد امیر تنظیم کے خطاب کو سننے کے لئے جمع تھے۔ اچھا خاصا کشادہ ہال تنگ پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ محترم خلیل بٹکل صاحب پروگرام کے آرگنائزر تھے۔ خدمتِ دین کے جذبہ سے مغلوب انتہائی فعّال شخصیت 'ان کا تعلق بھارتی ساحلی علاقہ بٹکل سے ہے۔

۲۴ نومبر۔ ناشتہ کی دعوت محترم خلیل بٹکل صاحب کے ہاں تھی۔ دعوت میں بھارت سے محترم ڈاکٹر مولانا ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) کے معتمد خاص جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بھی موجود تھے۔ مولانا علی میاں کی خیر خیریت بھی ان کی زبانی معلوم ہوئی۔ بٹکل برادری ہی کے ایک تاجر محترم محمد جعفری صدیق صاحب جنہوں نے دوبئی میں اسلامی طرز کا جدید سکول کھول رکھا ہے 'بھی موجود تھے۔ انہوں نے ۱۹۸۵ء میں ابوظہبی میں ہونے والے پروگرام کے وڈیو کیسٹس کے حوالے سے بتلایا کہ ان وڈیو کیسٹوں کو بھارت میں بہت قبول عام حاصل ہوا ہے۔ اور ان کے نہایت خوشگوار اثرات بھارت کے دور دراز کے علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ خود ان کی شہادت کے مطابق بعض الٹرا ماڈرن خاندانوں نے ان کیسٹوں سے اس درجے اثر قبول کیا ہے کہ ان مغرب زدہ خاندانوں کی وہ بچیاں جو نیم عریاں لباس پہن کر جاگنگ کیا کرتی تھیں اب اللہ کے فضل وکرم سے مکمل ستر حجاب کی پابندی کے ساتھ سکول و کالج جاتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مثال ہم پاکستانیوں کے لئے چیلنج ہے۔ جن کے خیال میں آج کے دور میں ستر وحجاب کی پابندی نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ محفل کے اختتام پر

شارجہ سے محترم ڈاکٹر اظہر زیدی صاحب اور محترم نصرت علی صاحب شارجہ کے پروگرام کے سلسلہ میں گفتگو کے لئے تشریف لے آئے۔ گیارہ بجے محترم جعفری صدیق صاحب کی دعوت پر اُن کا اسکول دیکھنے کے لئے گئے۔ ظہرانہ پھر محترم خلیل بٹکل صاحب ہی کی جانب سے تھا۔ موصوف کی خواہش تھی کہ دوبئی کا پروگرام مزید بڑھا دیا جائے۔ مگر پہلے سے طے شدہ شیڈول کے باعث یہ ممکن نہ تھا۔ چنانچہ طے یہ ہوا کہ لندن روانگی سے قبل دوبئی میں رات کا قیام رکھا جائے..... شام کو شارجہ میں پاکستان ویلفیئر سوسائٹی ہال میں "انقلاب اسلامی کا عملی طریقہ" کے عنوان سے امیر محترم نے دو گھنٹے تک مفصّل خطاب فرمایا۔ چھوٹا سا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ہزار کے لگ بھگ موجود افراد نے ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب کو پوری دلجمعی سے سُنا۔ یہاں ایک پرانے رفیق شاہد محمود سے بھی ملاقات ہوئی جو آج کل دوبئی میں مقیم ہیں۔

رائس الخیمہ سے رفقاء گرامی محترم طفیل گوندل صاحب اور محترم اقبال ملک صاحب بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ میجر امین منہاس صاحب سے تو قارئین میثاق خوب واقف ہیں، انکے بڑے صاحبزادے شاہد منہاس صاحب بھی پروگرام میں شریک رہے۔ عشائیہ کا اہتمام بھی محترم ڈاکٹر اظہر زیدی، محترم نصرت علی صاحب اور محترم شاہد منہاس صاحب ہی کی طرف سے تھا۔ شارجہ میں پروگرام کے آرگنائزرز بھی یہی احباب تھے۔ فارغ ہوتے ہوتے رات کا ایک بج گیا۔

۲۵۔ نومبر صبح مختلف احباب سے ملاقاتیں رہیں۔ عزیزم شاہد منہاس اور جماعت اسلامی کے ایک ذمہ دار بزرگ جناب صالح کنڈی صاحب بھی تشریف لائے۔ ساڑھے نو بجے ابوظہبی کے لئے روانگی ہوئی۔ ابوظہبی پہنچ کر برادرم نسیم الدین صاحب نے ابوظہبی میں آئندہ پروگرام کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ آج شام پاکستان مرکز میں حقیقت ایمان کے موضوع پر خطاب تھا۔ قریباً ۱۵۰۰ افراد پروگرام میں شریک تھے۔ رائس الخیمہ کے دونوں رفقاء اور دوبئی سے برادرم اقبال چوہدری صاحب بھی آج ہمارے ساتھ تھے۔ دعوت عشائیہ رفیق محترم عمران بٹ صاحب کے ہاں تھی۔

۲۶۔ نومبر آج بھی صبح کا زیادہ وقت امیر محترم اور محترم قاری عبدالباسط صاحب کے درمیان گفتگو ہی میں گزرا۔ عصر کے وقت ونگ کمانڈر سلیم بیگ صاحب اور جنرل امتیاز صاحب ملاقات کے لئے تشریف لے آئے۔ ان سے مختلف امور پر مفصل گفتگو ہوئی۔ آج پاکستان مرکز میں خطاب کا موضوع "ایمان حقیقی اور قانونی" تھا حاضری خوب رہی۔ فراغت حسب معمول نصف شب تک ہوئی۔

۲۷۔ نومبر آج جمعہ مسجد ترکی میں ادا کیا جو ابوظہبی کی انتہائی خوبصورت اور شاندار مسجد ہے۔ یہاں پاکستانی سفارت کار محترم انیس پرویز صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ ابوظہبی میں پروگرام کی اجازت حاصل کرنے میں موصوف کی کاوش کو بھی بڑا دخل حاصل تھا۔ ہم ان کے ممنون احسان ہیں اور دعا گو ہیں کہ رب العزت ان کو اجر عظیم عطا فرمائیں۔ شام کو ونگ کمانڈر سلیم بیگ صاحب سے پھر مفصل گفتگو رہی اسی شام محترم سراج الحق سید صاحب عازم پاکستان ہوئے اور محترم قاری عبدالباسط صاحب نے سعودی عرب کی راہ لی۔ رات شہر کے ایک ہوٹل میں محترم عبدالہادی شاہد صاحب نے اپنے احباب کے تعاون سے تھنکرز فورم (Thinkers Forum) کی جانب سے "دعوت رجوع الی القرآن"

کے ضمن میں ایک پروگرام کا اہتمام کر رکھا تھا صرف منتخب لوگ ہی مدعو تھے۔ امیر محترم نے "امت مسلمہ کے عروج و زوال کا پس منظر اور موجودہ دور میں دین کا کام کرنے کا طریقہ" کے موضوع پر بالکل ہی منفرد انداز میں انتہائی بصیرت افروز اور جامع خطاب ارشاد فرمایا۔ راقم کا اپنا خیال یہ ہے کہ ایسی بھرپور اور متاثر کن تقریر اس سے قبل اس نے بھی نہیں سنی تھی دیگر شرکاء کے تاثرات کا اندازہ تو قارئین خود لگا سکتے ہیں۔

۲۸۔ نومبر دن کا آغاز محترم جی۔ ایم خان صاحب کے ہاں پر تکلف ناشتہ سے ہوا۔ صبح کے اوقات میں مختلف احباب سے ملاقات رہی۔ آج دعوت ظہرانہ رفیق محترم قمر حسن صاحب کے ہاں تھی۔ وہیں سے دوبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ دوبئی میں ٹبکل برادری کے ایک اور دوست محترم محمد ابراہیم صاحب نے رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ نماز عشاء کے بعد محترم جعفری صدیق صاحب کے سکول پہنچے جہاں امیر محترم کے درس قرآن کا پروگرام تھا۔ انتظامات بہت عمدہ تھے۔ امیر محترم نے سورۃ الحج کے آخری رکوع کے حوالے سے مسلمانوں کی دینی ذمہ داریوں کے موضوع پر مفصل خطاب فرمایا۔ موسم میں خنکی کا عنصر نمایاں تھا۔ اس کے باوجود حاضری بھرپور تھی۔ امارات میں ہمارے پروگرام کی یہ آخری شام تھی۔

۲۹۔ نومبر دوبئی میں ہمارا قیام محترم جعفری صدیق ٹبکل صاحب کے ہاں تھا۔ صبح ناشتے کے بعد اعلان کے مطابق وہیں سوال جواب کی نشست منعقد ہوئی۔ ۲۰ افراد افہام و تفہیم کی غرض سے محفل میں شریک تھے جن میں سے پانچ حضرات نے بیعت کر کے ہمارے قافلہ میں شرکت کا ارادہ ظاہر کیا۔ ساڑھے دس بجے لندن کے لئے ایئرپورٹ روانگی ہوئی۔ حسب سابق محترم ظفر صاحب الوداع کہنے کے لئے موجود تھے۔ جہاز دو گھنٹے تاخیر سے روانہ ہوا۔ مگر تاخیر کا اعلان چونکہ جہاز میں سوار ہونے کے بعد کیا گیا لہٰذا وہ وقت بھی جہاز میں گزرا۔ جہاز کے کپتان اعجاز ڈودھی سے تعارف پر معلوم ہوا کہ وہ میثاق کے مستقل قارئین میں سے ہیں۔ موصوف کے ساتھ خوب گفتگو رہی۔ زیادہ وقت انہی کے کیبن میں گزرا۔ لندن میں شدید دھند کے باعث جہاز کو فرینکفرٹ اترنا پڑا۔ پی آئی اے کی طرف سے فرینکفرٹ شیرٹن میں قیام کا اہتمام کیا گیا تھا۔

۳۰ نومبر صبح طلوع آفتاب کے بارے میں استفساء پر بھانت بھانت کے جوابات سننے میں آئے۔ فجر کے وقت کے تعین میں خاصی دقت پیش آئی۔ بہرحال سوا سات بجے نماز پڑھ ہی لی۔ جو وہاں کے حساب سے فجر کا صحیح وقت تھا۔ ایک طویل اور بے مصرف انتظار کے بعد اللہ اللہ کر کے سوا ایک بجے لندن روانہ ہوئے۔ لندن ایئرپورٹ سے فارغ ہوتے ہوتے پونے چار بج گئے۔ محترم افسر صدیقی صاحب اور عزیزم تنویر الاسلام صاحب ہمیں خوش آمدید کہنے کے لئے موجود تھے۔ لندن میں قیام محترم افسر صدیقی صاحب ہی کے ہاں رہا۔

یکم دسمبر صبح نو بجے محترم صدیقی صاحب کے دفتر طہ پبلی روانگی ہوئی۔ راستہ ہی میں پروگرام کی تفصیلات طے کر لی گئیں۔ رفیق محترم ظہور الحسن صاحب نے فون پر اطلاع دی کہ وہ تھوڑی دیر میں پہنچ رہے ہیں۔ مگر خود گاڑی نہ چلا سکنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو گھنٹے بعد پہنچ پائے۔ مولانا عبدالغفار حسن

صاحب کے صاحبزادے 'مولانا صہیب حسن بھی ملاقات کے لئے وہیں تشریف لے آئے۔ مغرب تک ملاقاتوں کی نشست رہی۔ عشاء کے وقت واپس گھر پہنچے تو بہت سے ملاقاتیوں کو موجود پایا۔ امیر محترم کی ابتدائی تعارفی گفتگو کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چنانچہ یہ نشست رات دیر تک جاری رہی۔

۲۔ دسمبر۔ آج دن کا زیادہ وقت گھر پر ہی گزرا۔ محترم ظہور الحسن صاحب بھی بمعہ اہلیہ تشریف لے آئے۔ اسی دوران مشی گن سے رفیق محترم رشید لودھی صاحب کا فون آ گیا۔ محترم افسر صدیقی صاحب کی دفتر سے واپسی شام تین بجے ہوئی۔ رات کا کھانا جلد کھا کر لندن یونیورسٹی گئے جہاں سکالرز کے ایک اجتماع سے امیر محترم کو خطاب کرنا تھا۔ حاضرین میں کم و بیش پچاس سکالرز پی ایچ ڈی کی ڈگری رکھتے تھے۔ امیر محترم نے 'ISLAM TODAY' کے موضوع پر بزبان انگریزی بیس منٹ کا لیکچر دیا۔ امیر محترم نے اپنے خطاب میں واضح کیا کہ اس وقت اصل ضرورت ایمان کی آبیاری کی ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ امت کے ایمان کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ آج کا مفکر ایمان کی اہمیت کو نظر انداز کر کے اسلامی نظام حیات کے بارے میں سوچتا ہے۔ اور یہی 'ہماری بڑی غلطی ہے۔ پہلے ایمان ہو گا تو بات آگے چلے گی۔ محفل میں موجود سکالرز کی اکثریت بے حد متاثر تھی۔ بالخصوص محترم افسر صدیقی صاحب تو بہت خوش تھے۔ دراصل امیر محترم نے راستے میں کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ انہیں انگریزی پر عبور ہی حاصل نہیں ہے۔ جبکہ محترم صدیقی صاحب کا تبصرہ یہ تھا کہ میں نے آج تک کسی پاکستانی مقرر کو ایسی اچھی انگریزی بولتے نہیں سنا۔ واپسی پر جماعتِ اسلامی لندن کے مرکز ہوتے ہوئے آئے جہاں محترم رشید صدیقی صاحب اور محترم محمد علی کیانی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ محترم کیانی صاحب تفہیم القرآن کا ترکی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ اور محترم رشید صدیقی صاحب مرکز کے سابق صدر ہیں۔ مولانا مودودی مرحوم کا لندن میں قیام اکثر انہی کے ہاں ہوا کرتا تھا۔

۳۔ دسمبر آج مصروفیت کم تھی۔ محترم صدیقی صاحب سے پروگرام کی تفصیلات پر گفتگو ہوئی اور طے پایا کہ اسلامک کلچرل سنٹر میں پہلے دو روز عوامی دلچسپی کے حامل موضوعات یعنی "اسلام اور پاکستان" اور "اسلامی انقلاب کیا۔ کیوں۔ کیسے؟" پر گفتگو ہو۔ اور بعد کے ایام میں سورۃ الحدید کا درس مکمل کیا جائے۔ ۴ دسمبر کے لئے "اسلام اور پاکستان" کا اشتہار اخبار میں دے دیا گیا۔

۴۔ دسمبر نماز جمعہ کے لئے بالہام (BALHAM) کی مسجد میں جانا ہوا۔ جہاں خطبہ جمعہ امیر محترم نے انگریزی میں دیا۔ یہ مسجد لندن میں تبلیغی بھائیوں کا مرکز ہے۔ حاضری خوب تھی اور نوجوان تو خصوصاً بڑی تعداد میں تھے۔ بعد کے سوالات سے ان نوجوانوں کی دلچسپی کا اندازہ ہوا۔ نماز جمعہ کے بعد اردو میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ امیر محترم نے خطاب فرمایا۔ اور دینی جماعتوں کا نام لئے بغیر ان کے کاموں کا ایک بھرپور جائزہ پیش کیا۔ جہاں اچھے پہلو کی تعریف کی وہاں خامی اور کوتاہی کی نشاندہی بھی کی۔ حاضرین نے پوری توجہ سے خطاب سنا۔ اور اسی مسجد میں آئندہ کے لئے ایک اور خطاب کا وعدہ لے کر ہی واپسی کی اجازت دی۔ یہاں سے سیدھے محترم صدیقی صاحب کے دفتر آئے جہاں ایک نو مسلم سے ملاقات طے تھی مگر وہ کسی وجہ سے پہنچ نہ سکے۔ لہٰذا شام کے پروگرام کی تیاری کے لئے گھر واپس آ گئے۔ مغرب کے بعد پروگرام کی پہلی نشست کے لئے اسلامک کلچرل سنٹر 'ریجنٹ پارک کو روانگی ہوئی۔ ٹریفک جام

ہونے کے باعث راستہ ڈیڑھ گھنٹہ میں طے ہوا اور بمشکل نماز عشاء کی رکعت اول میں شامل ہو پائے۔ نماز عشاء کے بعد پروگرام شروع ہوا۔ امیر محترم کے خطاب کا موضوع تھا "اسلام اور پاکستان" ور کنگ ڈے اور موسم کی سختی کے باعث حاضری بہت زیادہ نہیں تھی۔ تاہم ڈھائی سو کے لگ بھگ افراد شریک محفل تھے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کا خطاب دو گھنٹوں پر محیط تھا جسے حاضرین نے پوری دلچسپی اور توجہ سے سنا۔

۵۔ دسمبر آج صبح ہی سے مطلع ابر آلود تھا۔ ناشتے کے بعد آئندہ سفر کی بکنگ کے لئے ڈاؤن ٹاؤن جانا ہوا۔ دن بھر بوندا باندی جاری رہی۔ اندازہ تھا کہ شام کی نشست کی حاضری پر آج کا موسم اثر انداز ہو گا۔ مگر خلاف توقع شرکاء کی تعداد کل سے زیادہ تھی۔ کم و بیش ۳۵۰ افراد ہال میں موجود تھے۔ خطاب کا موضوع تھا "پاکستان میں اسلامی انقلاب کیا۔ کیوں۔ اور کیسے؟" حاضرین کی دلچسپی کا اندازہ ان کے چہروں کے تاثرات سے بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ خطاب کے اختتام پر سوال جواب کی نشست کے لئے آخری دن کا تعین بھی کر دیا گیا۔

۶۔ دسمبر مسجد قریب نہ ہونے کے باعث نماز فجر چونکہ گھر پر ہی ادا کی جاتی تھی لہٰذا کچھ نوجوان موقع کو غنیمت جانتے ہوئے نماز فجر میں ہمارے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔ عموماً بعد میں گفتگو اور سوال و جواب کا سلسلہ چل نکلتا تھا۔ آج بھی نماز کے بعد اسلام اور پاکستان کے موضوع پر گفتگو رہی۔ نوجوانوں کے سوالات سے اسلام اور پاکستان کے بارے میں ان کی گہری دلچسپی ظاہر ہو رہی تھی۔ دوپہر ساڑھے بارہ بجے بالہام (BALHAM) کی مسجد روانگی ہوئی۔ مسلمانوں کے دینی فرائض کے موضوع پر ظہر تا عصر امیر محترم نے مفصل گفتگو فرمائی۔ یہاں حاضری خوب بھرپور تھی۔ مسجد ہی میں محترم ڈاکٹر علی رضا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ موصوف کا تعلق بہار سے ہے اور دین کے لئے درد رکھتے ہیں۔ اور اسی جذبہ کے تحت ہمارے ساتھ کمپنی کرتے رہے۔ سوان سی (SWANSEA) سے رفیق محترم صفدر حسین شاہ صاحب بھی محترم ظہور الحسن صاحب کے ہمراہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ بعد عشاء اسلامک کلچرل سنٹر میں آج سورۃ الحدید کے درس کا آغاز ہوا۔ اس سورۃ مبارکہ کے ساتھ امیر محترم کو ایک خصوصی قلبی لگاؤ ہے۔ لوگوں کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حاضری مسلسل بڑھ رہی تھی۔ یقیناً اللہ کا خصوصی فضل ہمارے شامل حال تھا۔

۷۔ دسمبر دن کے اوقات میں کوئی خاص مصروفیت نہ تھی۔ آج شام اسلامک سنٹر روانگی عزیزم تنویر الاسلام کے ہمراہ ہوئی۔ نہایت سرگرم کارکن اور نیک سیرت نوجوان ہیں اور اب ہمارے تنظیمی بھائی بھی ہیں۔ آج سورۃ الحدید کا دوسرا درس تھا جس میں نفاق کی حقیقت کا موضوع تفصیل سے زیر بحث آیا۔ بفضلہٖ تعالیٰ حاضری کا گراف مسلسل اوپر کی طرف جا رہا تھا۔

۸۔ دسمبر کی صبح محترم ڈاکٹر جمیل لغاری صاحب اور ان کی اہلیہ نے ملاقات کا وقت لے رکھا تھا۔ محترم لغاری صاحب لندن میں رہائش پذیر ہیں اور میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔ یہاں سے فارغ ہو کر محترم صدیقی صاحب کے دفتر روانہ ہوئے جہاں ملاقاتوں کا وقت طے تھا۔ سہ پہر دو بجے گھر واپسی ہوئی۔ اسلامک سنٹر میں آج بعد نماز عشاء حسب پروگرام سورۃ الحدید کا تیسرا درس ہوا حسب معمول حاضری پر نہ موسم کا اثر تھا اور نہ ہی ور کنگ ڈے کا۔ دلچسپی بدستور قائم تھی۔ درس کے بعد سوال و جواب کی نشست کے

لئے کوائف فارم تقسیم کئے گئے جن کے ذریعے سوال کرنے والے احباب کا مختصر تعارف بھی مقصود تھا۔ پروگرام سے فارغ ہو کر بیگم وڈاکٹر جمیل لغاری صاحب کے ہمراہ واپسی ہوئی عشائیہ بھی انہی کے ہاں تھا۔

۹۔ دسمبر آج بھی صبح کے اوقات محترم صدیقی صاحب کے دفتر میں ملاقاتوں کے لئے مخصوص تھے۔ ظہرانہ برادرم تنویرالاسلام کے ہاں تھا۔ جس کے بعد تھوڑا وقت آرام کے لئے مل گیا۔ اسلامک سنٹر میں بحمداللہ آج سورۃ الحدید کا مطالعہ مکمل کر لیا گیا۔ آج کی نشست بہت بھرپور تھی۔ واپسی پر محترم خرم بشیر صاحب سے بھی ملاقات ہو گئی۔ رات انہوں نے ہمارے ساتھ ہی قیام کیا۔ موصوف کا تعلق شیرانوالہ گیٹ لاہور سے ہے۔ امیر محترم سے زمانۂ طالب علمی سے ہی متعارف ہیں۔ آج کل برمنگھم میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔

۱۰۔ دسمبر صبح بذریعہ انڈر گراؤنڈ ٹیوب سفر کرتے ہوئے برادرم ظہورالحسن صاحب کے گھر پہنچے۔ شکاگو سے رفیق محترم سید پیر محمد صاحب کے بڑے بھائی محترم سید ہاشم صاحب بھی وہیں ملاقات کے لئے تشریف لے آئے۔ یہاں سے مولانا صہیب حسن صاحب کے ہاں جانے کا پروگرام تھا۔ وہاں مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی سے بھی ملاقات ہو گئی جو ایک طویل عرصے سے لندن ہی میں مقیم ہیں۔ یہیں محترم رشید صدیقی صاحب سے بھی مفصل ملاقات رہی۔ شام تک یہیں قیام رہا۔ مغرب کے بعد ریجنٹ پارک میں پروگرام کی آخری نشست کے لئے اسلامک کلچرل سنٹر روانگی ہوئی۔ آج کا پروگرام سوال وجواب کے لئے مخصوص تھا۔ یہ نشست اڑھائی گھنٹے تک بڑے بھرپور انداز میں جاری رہی۔ تمام سوالات تحریری شکل میں تھے۔ تقریباً چالیس "سوالنامے" حل کئے گئے۔ یہ خاصا نازک مرحلہ اللہ کے فضل سے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بلا کسی بدمزگی کے طے ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی لندن میں طے شدہ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

۱۱۔ دسمبر صبح ساڑھے دس بجے ساؤتھمپٹن (Southampton) کے لئے محترم شیر افضل خان صاحب کے ہمراہ روانگی ہوئی۔ موصوف کا تعلق منگورہ سوات سے ہے۔ ساؤتھمپٹن کی چھوٹی سی مسجد میں خطبہ جمعہ انگریزی زبان میں ہوا۔ یہاں امیر محترم نے حکمت واحکام کے موضوع کا انتخاب کیا۔ نماز کے بعد گھنٹہ بھر اردو میں بھی خطاب ہوا۔ ظہرانہ محترم شیر افضل صاحب کے ہاں تھا۔ چار بجے واپس لندن روانگی ہوئی۔ کچھ آرام کے بعد نماز عشاء کے فوراً بعد محترم صدیقی صاحب کے دفتر کا رخ کیا جہاں ان لوگوں کو ملاقات کی دعوت دی گئی تھی جو تنظیم سے وابستگی کے لئے آمادہ ہو چکے تھے۔ حاضری تو خوب تھی مگر امیر محترم نے جب لوگوں کے سامنے یہ بات واضح انداز میں رکھی کہ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ جذبات میں کئے گئے فیصلے دیرپا نہیں ہوا کرتے تو خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ تاہم اس تنبیہہ کے باوجود ۲۰ حضرات اور پانچ خواتین بیعت کر کے تنظیم کے قافلے میں شامل ہو گئے۔ آج کا عشائیہ محترم ڈاکٹر علی رضا صاحب کے ہاں تھا۔ رات گئے تک مصروفیت رہی۔

۱۲۔ دسمبر آج کا دن برمنگھم کے لئے مخصوص تھا۔ دو گاڑیوں پر مشتمل چھوٹے سے قافلے میں امیر محترم اور راقم کے علاوہ محترم سید ہاشم صاحب برادرم تنویرالاسلام صاحب محترم ڈاکٹر علی رضا صاحب، رفیق محترم ظہورالحسن صاحب اور محترم ڈاکٹر حافظ میاں اعجاز صاحب بھی شامل تھے۔ برادرم تنویرالاسلام

صاحب نے اپنی ڈرائیونگ کے خوب جوہر دکھائے اور ہم ٹھیک نماز ظہر کے وقت بر منگھم پہنچ گئے نماز کے بعد ظہرانہ میں شرکت کی جس میں مقامی حضرات کی بھی ایک بڑی تعداد مدعو تھی۔ بر منگھم کی خوبصورت مسجد کے ساتھ ہی اسلامک سنٹر قائم ہے اور اس کے ڈائریکٹر محترم ڈاکٹر خالد علوی صاحب ہیں۔ موصوف جامعہ پنجاب میں استاد رہے ہیں اور نیو کیمپس کی جامع مسجد میں جمعہ بھی پڑھاتے رہے ہیں۔ اسی سنٹر میں مقامی میڈیکل ڈاکٹرز ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام پروگرام ہوا۔ سنٹر کے پچھلے ہال میں امیر محترم کے خطاب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سورۃ الحج کے آخری رکوع کا درس اڑھائی گھنٹے تک جاری رہا۔ ہال پُر تھا۔ اندازہ ہے کہ قریباً تین سو افراد شریک پروگرام تھے امیر محترم نے آج چونکہ کھڑے ہو کر خطاب فرمایا تھا لہٰذا بعد میں کمر میں قدرے تکلیف محسوس کر رہے تھے۔ واپسی کا سفر دشوار رہا۔ مگر محترم ڈاکٹر میاں حافظ اعجاز صاحب کے ساتھ تمام راستہ خدمت دین کے موضوع پر مفید گفتگو رہی۔ موصوف نے لندن پہنچ کر تنظیم میں شمولیت کا ارادہ ظاہر کیا اور امیر محترم کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ محترم حافظ صاحب بائیو کیمسٹری میں پی ایچ ڈی ہیں۔ سعودی عرب میں طویل عرصہ تک مقیم رہے۔ مدینہ یونیورسٹی سے بھی فارغ التحصیل ہیں۔ آج کل لندن میں تقریباً ہمہ وقت دین کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے ہیں۔

۱۳۔ دسمبر صبح امیر محترم کی طبیعت بہتر تھی۔ اور انہوں نے آج جدّہ روانگی ایک روز کے لئے ملتوی کر دی۔ تاکہ لندن میں نئے رفقاء سے تنظیمی امور پر تفصیلی گفتگو ہو سکے۔ چنانچہ اسی غرض سے امیر محترم ایک نئے رفیق محترم عبدالعزیز صاحب کے ہاں منتقل ہو گئے، جن کی رہائش گاہ لندن کی نسبتاً مرکزی جگہ " " میں واقع ہے۔ وہاں شام کو رفقاء لندن کا تنظیمی سطح پر پہلا باقاعدہ اجتماع ہوا۔ اس اجتماع کے موقع پر رفقاء کی تعداد ۳۴ ہو گئی جن میں ۲۶ مرد اور ۸ خواتین شامل ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ان نئے رفقاء گرامی کو ہمت و استقامت عطا فرمائیں۔ اور اپنے دین کی خدمت کے لئے ان سب کو قبول فرمالیں۔ (آمین) راقم الحروف محترم صدیقی صاحب ہی کے ہاں سے سیدھا ایئرپورٹ روانہ ہوا۔ جہاں سے نیویارک روانگی مقصود تھی۔ محترم صدیقی صاحب اور برادرم تنویر الاسلام ہمراہ تھے۔ ایئرپورٹ پر محترم ڈاکٹر علی رضا صاحب، محترم ڈاکٹر میاں اعجاز صاحب اور محترم ظہور الحسن صاحب الوداع کہنے کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے۔

۱۴۔ دسمبر دن کا تمام وقت امیر محترم کا ملاقاتوں میں گزرا۔ اسی رات امیر محترم عمرے کی غرض سے جدہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ جہاں پندرہ دسمبر کی صبح پہنچتے ہی فوراً عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ ۱۶ دسمبر کو مدینہ طیبہ حاضری دی۔ رات کا قیام بھی مدینے ہی میں رہا۔ وہاں رفیق محترم شاہد خلیل صاحب سے بھی ملاقات رہی۔ ۱۷ اور ۱۸ دسمبر کے دن جدّہ میں رفقاء تنظیم سے ملاقات کے لئے مخصوص تھے۔ امیر محترم سے ملاقات کے لئے پورے سعودی عرب سے رفقاء جدہ میں جمع ہو گئے تھے۔ اس موقع پر جدّہ کے رفقاء کی کوشش تھی کہ اجتماع عام کا اہتمام بھی ہو جائے۔ چنانچہ آخری وقت میں اجازت مل گئی تو مسجد تعاون میں ۱۷ اور ۱۸ دسمبر کی شام مسلسل دو نشستوں میں خطاب عام کے پروگرام ہوئے۔ جو مناسب تشہیر نہ ہو سکنے کے باوجود انتہائی بھرپور اور کامیاب اجتماعات رہے۔ روزانہ حاضری کا اندازہ ایک ہزار کے لگ بھگ تھا۔

۱۹۔ دسمبر کا دن پھر تنظیمی امور کے لئے مخصوص تھا۔ اسی روز کراچی روانگی ہوئی۔ جہاں ۲۰ دسمبر کو تنظیم اسلامی کراچی کے اجتماع میں شرکت کے علاوہ بزرگ رفیق محترم بھائی جمیل الرحمان صاحب کی عیادت فرمائی۔ موصوف ان دنوں صاحب فراش تھے۔ الحمدللہ اب روبصحت ہیں اس انتہائی مصروف اور تھکا دینے والے دورے کے بعد امیر محترم ۲۱ دسمبر کی صبح اللہ کی تائید و توفیق سے بخیر و عافیت لاہور پہنچ گئے۔ اب کچھ مختصر بیان راقم الحروف کے امریکہ قیام کا بھی ہو جائے کہ یہ بھی اسی سفر کا حصہ تھا۔ راقم ۱۳ دسمبر کی تاریخ ہی میں نیویارک پہنچ گیا۔ ایئرپورٹ پر نیویارک سے ہمارے رفیق محترم الطاف احمد صاحب کے علاوہ رفیق محترم ڈاکٹر خورشید ملک کے بھتیجے عزیزم ڈاکٹر اطہر ملک اپنے دوست عزیزم طارق صاحب کے ہمراہ موجود تھے۔ اسی رات شکاگو روانگی ہوئی۔ جہاں ۱۹ دسمبر تک قیام رہا۔ یہاں راقم کے میزبان حسب معمول برادرم محترم ڈاکٹر خورشید ملک صاحب تھے۔ شکاگو میں قیام کے دوران رفقاء سے انفرادی و اجتماعی ملاقاتیں ہوئیں۔ تنظیمی امور کے ساتھ S.S.O کے معاملات بھی زیر بحث آئے۔ ۱۹ تا ۲۲ دسمبر تک مشی گن کے شہر ڈیٹرائٹ میں برادرم رشید لودھی صاحب کے ہاں قیام رہا۔ گزشتہ سفر کے دوران یہاں کچھ احباب نے تنظیم میں شمولیت کی غرض سے بیعت کی تھی۔ مگر ان کے ساتھ باقاعدہ تنظیمی سطح پر کوئی تفصیلی گفتگو نہ ہو سکی تھی۔ حالیہ سفر خاص اسی غرض سے تھا۔ ٹورنٹو سے بھی تقریباً بھی رفقاء وہاں آ گئے تھے۔ چنانچہ ٹورنٹو کے امور بھی تفصیل سے زیر گفتگو آئے۔ ۲۲ دسمبر کا دن رفیق محترم رضا علی بابر صاحب کے ہمراہ گزار کر شام کو راقم نیویارک روانہ ہوا۔ جہاں سے براہ راست پرواز کے ذریعہ ۲۳ دسمبر کی شام جدہ پہنچا۔ جدہ میں قیام برادرم محترم اصغر حبیب صاحب کے ہاں تھا۔ اگلے روز عمرہ کی سعادت حاصل کی ان دنوں ہمارے ایک محترم رفیق جو قرآن اکیڈمی ہاسٹل کے انچارج بھی ہیں، میجر محمود احمد صاحب بھی پاکستان سے عمرہ کی غرض سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان کی معیت بھی وہاں حاصل رہی۔ ۲۵ دسمبر کو ریاض، الواسع اور طائف وغیرہ سے رفقاء ملاقات کے لئے تشریف لے آئے۔ جدہ کے رفقاء بھی اس موقع پر موجود تھے سعودی عرب کی سطح پر تنظیمی امور زیر بحث رہے۔ ۲۶۔ دسمبر کو دوبارہ عمرے کے لئے مکہ کا رخ کیا اس مرتبہ چار روز حرم مکی میں قیام رہا۔ ۳۰ دسمبر کو واپس جدہ آ کر اگلے روز برادرم فیض اللہ ملک صاحب اور محترم میجر محمود احمد صاحب کے ہمراہ مدینہ منورہ کے لئے روانگی ہوئی۔ شب وہیں گزار کر فجر کے وقت مکہ مکرمہ واپس آئے اور نماز فجر حرم شریف میں ادا کی۔ شام تک جدہ واپس پہنچ گئے۔ یکم اور دو جنوری کے دن تنظیمی امور کے لئے مخصوص تھے۔ ۲ جنوری کی رات کراچی کے لئے روانگی ہوئی۔ اور ۳ جنوری کی شام بخیر و عافیت واپس لاہور پہنچ گیا۔ اس سفر کے دوران ابوظہبی۔ برطانیہ۔ امریکہ اور سعودی عرب کے رفقاء گرامی اور احباب نے جس محبت اور خلوص کا اظہار فرمایا اور قیام کے دوران بالکل گھر کی سی سہولتیں مہیا فرمائیں۔ اس سب کے لئے ہم سب ہی کے فرداً فرداً مشکور و ممنون ہیں بالخصوص ابوظہبی کے رفیق محمد حسن انجم صاحب کا ذکر نہ کرنا احسان ناشناسی ہوگی جو ہماری سہولت کی خاطر اپنے گھر کو چھوڑ کر اپنی اہلیہ اور بچوں سمیت عارضی طور پر جمعیت خدام القرآن کے دفتر کے قریب ایک فلیٹ میں مقیم ہو گئے تھے ہمارا قیام تو دفتر میں تھا لیکن ہمارے طعام کی تمام تر ذمہ داری حسن انجم صاحب نے اپنے سر لی تھی۔ ہماری دعا ہے کہ رب العزت ان سب احباب و رفقاء کا خلوص اور ان کی سعی و جہد کو قبول فرمالیں۔ (آمین)

معمولی کوشش — بہت بڑا اجر

ادارہ 'میثاق' کے ساتھ عملی تعاون کی ایک صورت!

اگر آپ 'میثاق' کے مستقل خریدار ہیں اور اسے اپنے لیے مفید خیال کرتے ہیں تو فطری طور پر آپ کی یہ خواہش بھی ہوگی کہ اسے اپنے حلقۂ احباب میں متعارف کرائیں۔ ویسے بھی نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس فرمان کی روشنی میں کہ "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے" یہ ہمارا دینی و اخلاقی فریضہ بھی بنتا ہے کہ ماہنامہ 'میثاق' کے ذریعے جو علمی و فکری رہنمائی ہمیں حاصل ہو رہی ہے اُسے عام کرنے کی کوشش کریں۔

آپ کا حلقۂ احباب یقیناً بہت وسیع ہوگا۔ لیکن آغازِ کار کے طور پر آپ اپنے احباب میں سے صرف دو حضرات کو 'میثاق' کا سالانہ خریدار بنا دیجئے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کی ذرا سی کاوش سے کسی شخص کی زندگی کا رُخ بدل جائے، اُس کے باطن میں ایمان کی حرارت پیدا ہو جائے، اُس کا تصورِ دین درست ہو جائے اور وہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے۔ اور اس طرح اس کے نیک اعمال کا ثواب آپ کو بھی برابر ملتا رہے۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "خیر کی جانب رہنمائی کرنے والا، خیر کا کام کرنے والے کی مانند ہے!"

آپ کی سہولت کے پیشِ نظر سالانہ خریداری کے کوپن منسلک کر دیئے گئے ہیں جن کی مدد سے آپ اپنے عزیز رشتہ داروں یا احباب میں سے کسی ایک یا دو حضرات کے نام ماہنامہ 'میثاق' جاری کرا سکتے ہیں۔ اندرونِ پاکستان اس پر ٹکٹ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔

تنظیم اسلامی حلقہ ملتان کی دعوتی سرگرمیاں

مرتب: مختار حسین فاروقی

'تنظیم اسلامی' جن انقلابی قدروں کی داعی ہے اس منزل اور وادی کی راہیں بڑی کٹھن اور حوصلہ شکن ہیں۔ اپنے 'آج' کو 'کل' کے لئے قربان کر دینا اس راستے کا پہلا قدم ہے۔ 'حبِ عاجلہ' اور فوری مفادات ابنِ آدم کو فکرِ فردا سے بے نیاز کئے رکھتے ہیں۔ ایسے ماحول میں رفقائے تنظیم کے لئے لازم ہے کہ وہ جیسے ہوا اور پانی کی ضرورت کا احساس رکھتے ہیں اسی طرح دعوت اور تربیت کو روحانی زندگی کے لئے ضروری سمجھیں۔ جیسے ہوا اور پانی کے بغیر مادی اور جسمانی حیات کا تسلسل ناممکن ہے بعینہٖ اسی طرح دعوت اور تربیت پر توجہ کے بغیر آدمی کا اس غلط ماحول میں اپنے اسلام اور ایمان کو بچالے جانا ناممکن ہے۔

حلقۂ ملتان کی سرگرمیوں میں بحمداللہ 'دعوت' اور 'تربیت' ہی دو نمایاں اور اہم گوشے ہیں بلکہ صحیح تر الفاظ میں صرف انہی دو کاموں پر پوری توجہ مرکوز ہے۔

☆ دعوت کے ضمن میں کیسٹوں اور کتابوں کے سٹال اور خطابات عام کے علاوہ مرکز ملتان میں ہفتہ وار اجتماعِ جمعہ بھی ہے۔ رفقاء امیرِ محترم کے کیسٹ اور کتب کے (نماز جمعہ کے بعد مساجد کے باہر) سٹال کا اہتمام کرتے ہیں' جس میں فروخت برائے نام سہی' تنظیم کی بنیادی دعوت کی ایک خاموش تبلیغ ہو رہی ہے۔

☆ شجاع آباد میں رفیق محترم محمد سعید بھٹہ صاحب جمعرات کی شب تشریف لے جاتے ہیں' مغرب تا عشاء مطالعہ قرآن کی نشست ہوتی ہے' رفقاء اور محنت اور تندہی سے کوشش کریں تو یہ نشست قرآنِ مجید کے ذریعے فرائضِ دینی کے تصور کو اجاگر اور عام کرنے میں بہت مفید ہو سکتی ہے۔

☆ وہاڑی میں ہر اتوار کی شب ڈاکٹر منظور حسین صاحب قیمِ حلقہ تشریف لے جاتے ہیں ملاقاتوں کے علاوہ مغرب تا عشاء منتخب نصاب (۱) کا درس ہوتا ہے۔

☆ مرکزِ ملتان میں جمعہ کی شام عصر تا رات دس بجے ایک اجتماع ہوتا ہے جس میں رفقائے ملتان کے علاوہ دوسرے حضرات بھی تشریف لاتے ہیں۔ اس پروگرام میں مغرب تا عشاء عام درس قرآن ہوتا ہے جس کے لئے ہینڈ بل بھی طبع کرائے گئے ہیں اور ان کو وسیع حلقے میں پھیلایا گیا ہے' نماز جمعہ کے بعد مختلف مساجد میں بھی تقسیم کیا گیا ہے۔ قریبی تعلیمی اداروں اور دفاتر میں بھی تقسیم ہوئے ہیں۔ حاضری الحمدللہ اب ۳۰ سے متجاوز ہے اس میں نصف سے زیادہ غیر رفقاء شریک ہوتے ہیں۔

درس کے علاوہ اس پروگرام میں مطالعۂ کتب اور مذاکروں کا پروگرام ہوتا ہے جس سے کہ رفقاء

میں تنظیم کی دعوت کو سمجھنے اور اس کے اظہار پر قدرت حاصل ہو سکے۔ کھانے کی نشست میں رفقاء گھروں سے لایا ہوا کھانا کھاتے ہیں اور یوں یہ وقت خوش اسلوبی سے (بغیر کسی بوجھ اور گھبراہٹ کے) گونا گوں سرگرمیوں میں صرف ہوتا ہے۔

☆ جھنگ میں بھی منتخب نصاب کے درسِ قرآن کی ایک نشست باقاعدگی سے منعقد ہو رہی ہے۔ عمل صالح کی تفاصیل میں سورۂ بنی اسرائیل کے رکوع ۳ اور ۴ پڑھ لئے ہیں' سردی کے موسم اور ٹی وی ڈراموں کی وبا کے باوصف نمازِ عشاء کے بعد کی یہ نشست حاضری کے اعتبار سے بہت کامیاب ہے ۳۰۔۳۵ احباب شریکِ درس ہیں۔

☆ خطاباتِ عام کے پروگرام میں مجلسِ مشاورت منعقدہ ۵ نومبر کے مطابق آخری پروگرام رحیم یار خان کا تھا جس میں راقم حاضر ہوا۔ ۳ دسمبر بروز جمعرات سوا بارہ بجے پہنچا۔ رانا غلام اکبر صاحب کے ساتھ مغرب تک ملاقاتوں کا پروگرام تھا نماز مغرب کے بعد جامعہ فاروقیہ کی وسیع مسجد کے ہال میں درسِ قرآن کا پروگرام تھا سورۂ حج کی آخری دو آیات کے حوالے سے ہمارے دینی فرائض کی وضاحت اور ضمناً تنظیم کی دعوت سامنے رکھی۔ حاضری بحمد اللہ ۲۰۰ سے متجاوز تھی اور احباب نے پون گھنٹہ توجہ سے گفتگو کو سنا۔

نماز عشاء کے بعد رفقائے رحیم یار خان و صادق آباد کا اجتماع تھا اس میں مقامی طور پر توسیع دعوت اور اس کے راستے میں حائل رکاوٹوں کا جائزہ لیا گیا اور راقم نے اپنے علم و فہم کی حد تک مشورے دیئے۔

۴ر دسمبر بروز جمعہ بعد نماز فجر امانت کالونی رحیم یار خان (جو رانا صاحب کے دو گھروں کے درمیان ہے) سورۂ جمعہ کی آیات کے حوالے سے قرآن مجید کے مسلمانوں پر حقوق کی وضاحت کی۔ چالیس کے قریب احباب شریک رہے مسجد کے متولی 'چوہدری..... صاحب' علالت کے باعث تشریف نہیں لا سکے تھے وہ ساتھ ملحقہ اپنے مکان کے کمرے میں سماعت فرماتے رہے۔ مسجد ہذا اور اس کے متولی صاحب تنظیم کے رفقاء کے لئے خصوصی دلچسپی کا باعث ہیں کہ اس مسجد میں خطبہ جمعہ کے طور پر امیر محترم کا آدھ گھنٹے کا کیسٹ سنایا جاتا ہے اور اس کا باقاعدہ مسجد کے باہر ایک مستقل بینر بھی لگا ہوا ہے اس کیسٹ کو سنانے سے پہلے چوہدری صاحب خود غور سے سنتے ہیں الحمد للہ وہ تنظیم کی دعوت سے دن بدن قریب آ رہے ہیں اللہ تعالیٰ وہ دن بھی لائے کہ وہ ہمارے ساتھی بن جائیں۔

جمعہ ہی کے روز صبح ۱۰ بجے یونائیٹڈ ہوٹل میں ایک استقبالیہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں چالیس کے قریب احباب تشریف لائے گفتگو کا موضوع تھا' اسلامی انقلاب کیا؟ کیوں؟ کیسے؟' سوا گھنٹہ کی سادہ زبان میں گفتگو کے بعد سوال و جواب کی نشست ہوئی بعد ازاں چائے کی تواضع کے بعد یہ مجلس برخاست ہوئی۔ شرکاء میں معززینِ شہر شامل تھے جس میں بعض مقامی علماء اور سیاسی کارکن نمایاں تھے۔

☆ اواخر دسمبر میں منعقد ہونے والی ہفت روزہ تربیت گاہ ہی نمایاں اہمیت کا حامل پروگرام تھا۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ۴ر دسمبر اور ۲۵ر دسمبر کے درمیان کوئی اضافی پروگرام نہیں رکھا تھا۔

امیر تنظیم اسلامی سندھ سید سراج الحق صاحب کو اللہ تعالیٰ نے تعلیم دعوت کے ضمن میں خاص صلاحیتوں سے نوازا ہے گذشتہ ماہ نومبر میں ان کے دورۂ سعودی عرب و عرب امارات کے دوران وہاں

ان کے طریق تعلیم کی دھوم مچ گئی جس کی صدائے بازگشت مرکزِ تنظیم اسلامی لاہور میں بھی پہنچی۔ اس کا ذریعہ وہ رابطہ خطوط بنے جو وہاں کے رفقاء باقاعدگی سے مرکز کو ارسال کرتے رہتے ہیں۔ مزید برآں امیرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ العالی بھی مغربی ممالک کے سفر کے بعد عمرہ کے لئے سعودی عرب تشریف لے گئے تو انہیں بھی رفقاء کے تاثرات معلوم ہوئے اس سبب سے سید صاحب کو دورانِ تربیت گاہ ڈیڑھ دن کے لئے ملتان تشریف آوری کی دعوت دی گئی جو انہوں نے قبول فرمائی اور حسبِ پروگرام شرکت فرمائی۔ پروگرام میں شرکت کے لئے رفقاء جمعہ کی صبح ہی سے مرکز ملتان میں آنا شروع ہو گئے تھے۔ ہفتہ وار درسِ قرآن جو جمعہ کو مغرب تا عشاء ہوتا ہے اس میں رفقاء و غیر رفقاء کی بھرپور شرکت تھی جگہ کی تنگی کا احساس ہو رہا تھا۔

درس کے بعد کھانا اور اس کے بعد آٹھ روزہ تربیت گاہ کے نظام الاوقات کی تفصیل شرکاء کے سامنے رکھی۔ کراچی سے جناب سید سراج الحق صاحب کی آمد کی اطلاع بھی دی گئی اور اتوار کے خصوصی پروگرام کا اعلان بھی کیا گیا۔

اتوار کے علاوہ نظام الاوقات حسب ذیل رہا۔

بعد نماز فجر..... درس قرآن..... سورۂ حدید.. ضیاء الرحمٰن صدیقی صاحب، عطاء اللہ صاحب
صبح ساڑھے آٹھ بجے سے ایک بجے تک..... مطالعہ کتب، مذاکرہ، سوال جواب
عصر تا رات ساڑھے نو بجے..... تعلیم عربی۔ مطالعہ کتب
ڈاکٹر صاحب کے ویڈیو کیسٹ کا پروگرام

.....

اس پروگرام میں مندرجہ ذیل کتب کا سبقاً سبقاً مطالعہ کیا گیا اور سوال و جواب کی نشستیں ہوئیں۔

۱۔ دعوتِ دین اور اس کا طریق کار (مولانا امین احسن اصلاحی صاحب)
۲۔ رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم (ڈاکٹر اسرار احمد صاحب)

پروگرام میں تقریباً ۲۴ رفقاء نے شرکت کی اتوار کے روز ۳۳ رفقاء کی حاضری تھی جس میں سید سراج الحق صاحب نے امیر محترم کی کتاب منہج انقلاب نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا مطالعہ اور مذاکرہ کرایا۔ یہ پروگرام صبح ساڑھے آٹھ بجے سے شام ۸ بجے تک نمازوں اور کھانے کے وقفے کے بعد تقریباً دس گھنٹے جاری رہا جس کے بعد شرکاء کے تاثرات بڑے دلچسپ تھے۔ ایک رفیق نے لکھا کہ یہ پروگرام ۳۰ گھنٹے جاری رہنا چاہئے تھا۔ تمام رفقاء کا مشترک احساس تھا کہ اس پروگرام کے بعد وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلاب کے چھ مراحل پہلے سے کہیں بہتر انداز میں سمجھ گئے ہیں اور کسی حد تک ان کو بیان بھی کر سکتے ہیں۔

.....

تربیت گاہ کے متصل بعد یعنی یکم جنوری ۱۹۸۸ء کو حلقہ کے تمام رفقاء کا ایک روزہ اجتماع تھا جس میں امیرِ محترم بھی تشریف لانے والے تھے۔ یہ پروگرام صبح ۹ بجے شروع ہوا رفقاء کی تعداد ۶۰ کے لگ بھگ

تھی۔ پروگرام میں جائزہ رپورٹ وہاڑی، بہاولپور، لیہ، ملتان، رحیم یار خان، جھنگ کی دعوتی سرگرمیاں اور آئندہ کے لئے تجاویز شامل تھیں۔

جمعہ کے وقفہ کے بعد مجلس مشاورت کا اجتماع ہوا جس میں آئندہ تین ماہ جنوری، فروری، مارچ کے پروگرام ترتیب دیئے گئے۔ عصر تا مغرب اجتماع میں حاضری ۹۰ کے قریب تھی۔ آئندہ کے پروگرام کی تفاصیل پر روشنی ڈالی گئی اور بعد نمازِ مغرب امیرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تقریر کے لئے انتظامات کا جائزہ لیا گیا۔

مغرب کے بعد اجتماع کے لئے دعوتی کارڈ تقسیم کئے گئے تھے جس میں ملتان کے ان لوگوں کو خصوصی دعوت پر بلایا گیا تھا جو تنظیم کے فکر سے آشنا ہیں اور امیرِ محترم کے دروس و خطابات میں پہلے بھی حاضر باش رہے ہیں۔

اس اجتماع میں امیر محترم نے "تنظیم اسلامی کی دعوت" کے عنوان سے خطاب فرمانا تھا۔ فلائٹ کے مؤخر ہو جانے کی وجہ سے امیر محترم ۸ بجے بعد نماز عشاء تشریف لا سکے۔ مغرب تا عشاء حاضری ۲۵۰ کے قریب تھی مگر شدید انتظار کے باعث کافی لوگ چلے گئے۔ مغرب تا عشاء راقم نے شرکاء کے مختلف سوالات کے جواب دیئے اور تنظیم اسلامی کی دعوت اور انقلاب کے مراحل کو واضح کیا۔

امیرِ محترم کا خطاب سوا آٹھ بجے شب شروع ہوا اور تقریباً سوا گھنٹے کے خطاب میں ڈاکٹر صاحب نے تنظیم کی دعوت کو حاضرین کے سامنے مؤثر انداز میں پیش فرمایا۔ حاضرین کی تعداد دو صد کے لگ بھگ تھی۔ تقریر کے اختتام پر حلقہ ملتان کے پروگراموں کے اعلان اور دس رفقاء کی تنظیم میں شمولیت کی بیعت پر یہ پروگرام بخیر و خوبی برخاست ہوا۔

.....

اس پروگرام کے دوران آٹھ روز کے لئے مرکز ملتان میں خوب چہل پہل اور رفقاء کی آمد و رفت رہی۔ قال اللہ اور قال الرّسول کی صداؤں کے درمیان تنظیم کی دعوتِ انقلاب اور اقامتِ دین کی پکار دلوں کو گرماتی رہی، اللہ کرے کہ ہماری یہ حقیری سی کوششیں کسی خطۂ ارضی پر بالفعل سلامی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوں اور کرنل حیدر ترین صاحب کی یہ دی ہوئی جگہ اور لگایا ہوا یہ پودا ابدالآباد تک نیکیوں کے برگ و بار لاتا رہے تاکہ کرنل صاحب بھی کہہ سکیں کہ ع

شادم بر عمر خویش کہ کارے کردم

.....

برائے توجہ!

قارئین میثاق سے گذارش ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں (شکریہ)

ایک مسنون دعا

اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قُلُوْبَنَا مِنَ النِّفَاقِ وَاَعْمَالَنَا مِنَ الرِّیَاءِ وَاَلْسِنَتَنَا مِنَ الْکِذْبِ وَاَعْیُنَنَا مِنَ الْخِیَانَۃِ فَاِنَّکَ تَعْلَمُ خَائِنَۃَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ۔

ترجمہ

اے اللہ ہمارے دلوں کو نفاق سے پاک کر دے اور ہمارے اعمال کو ریا سے اور ہماری زبانوں کو جھوٹ سے اور ہماری آنکھوں کو خیانت سے تجھ پر روشن ہیں آنکھوں کی چوریاں بھی اور دل جو کچھ چھپائے رکھتے ہیں۔

* * *

عطیہ اشتہار

میاں عبد الواحد

بھگوان سٹریٹ، پرانی انار کلی، لاہور

نام بھی اچھا — کام بھی اچھا
صُوفی سوپ ہے سب سے اچھا

صُوفی سوپ

اُجلی اور کم خرچ دُھلائی کے لیے بہترین صابن

صُوفی سوپ اینڈ کیمیکل انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
تار: صُوفی سوپ
ٹیلکس:
۳۹۔ فلیمنگ روڈ، لاہور۔ ٹیلی فون نمبر: ۲۲۵۴۴۷ - ۵۴۵۲۳

پیلو کی بازیافت
مِسواک سے
ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ تک
پیلو کے مؤثر اور مجرب اجزا پر مشتمل ایک مکمل طبی ٹوتھ پیسٹ پیش کر کے ہمدرد نے
حفظِ دنداں کی دنیا میں بھی اوّلیت حاصل کر لی ہے۔
پیلو صدیوں سے دانتوں کی صفائی اور مسوڑھوں کی مضبوطی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔
ہمدرد کی تحقیقِ جدید نے پیلو کے ان افادی اجزاء اور دوسری مجرب جڑی بوٹیوں سے ایک جامع
فارمولے کے مطابق ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ تیار کیا جو پوری طرح دانتوں اور مسوڑھوں
کی حفاظت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
ہمدرد
پیلو ٹوتھ پیسٹ
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
پیلو کے اوصاف مسوڑھے مضبوط دانت صاف
پاکستان سے محبت کرو۔ پاکستان کی تعمیر کرو
Adarts-HTP-3/85

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا

اور سب مل کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑو اور پھوٹ نہ ڈالو

Seiko
BRAKE + CLUTCH LINING

ملیسی فرگوسن ٹریکٹر کے ہر ماڈل پرزہ جات کے ہول سیل ڈیلر

S SEIKO سٹاکسٹ: طارق آٹوز ۱۳۔ نظام آٹو مارکیٹ بادامی باغ لاہور۔ فون: ۲۰۰۹۶۰

تازہ، خالص اور توانائی سے بھرپور

پاک پیئور®

مکھن اور دیسی گھی

یونائیٹڈ ڈیری فارمز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
(قائم شدہ ۱۸۸۰) لاہور
۲۲- لیاقت علی پارک ۴- بیڈن روڈ- لاہور، پاکستان۔
فون: ۳۱۲۷۵۴-۲۲۱۵۹۸

SV ADVERTISING

THE ROARING LION OF AGRO-CHEMICAL INDUSTRY

BUBBER SHER UREA ®

THERE ARE PEOPLE WHO DO THINGS, AND THERE ARE PEOPLE WHO DO THINGS WELL.

AT DAWOOD HERCULES WE DO THINGS WELL ! RIGHT FROM OUR INCEPTION 12 YEARS AGO WE'VE BEEN ENGAGED IN A TREMENDOUS OUTPUT, ENSURING BETTER AND HEALTHIER CROPS AND STRENGTHENING THE NATIONAL ECONOMY. DURING THIS TIME WE'VE :

a. PRODUCED 4,000,000 TONS OF BUBBER SHER UREA.
b. SAVED MORE THAN US $ 750,000,000 IN FOREIGN EXCHANGE FOR PAKISTAN.
c. CONTRIBUTED RS. 2000,000,000 TO THE NATIONAL TREASURY IN THE FORM OF DEVELOPMENT SURCHARGE, DUTIES AND TAXES.
d. SAVED FERTILIZER SUBSIDY WORTH RS. 3000,000,000 IN OUR PRODUCTION WHICH WAS USED BY THE GOVERNMENT TO SUBSIDIZE FERTILIZER PRICES, GIVING AN ENORMOUS BENEFIT TO THE FARMER.

BROADLY SPEAKING WE ARE COMMITTED TO A BETTER QUALITY OF LIFE FOR OUR PEOPLE AND WE ARE DEVOTING OUR VAST TECHNOLOGICAL RESOURCES AND AGRO-CHEMICAL KNOW-HOW TO PROVIDING A VITAL INPUT FOR DEVELOPING HEALTHIER CROPS.

WE FEEL PROUD OF THESE ACHIEVEMENTS, AND SHALL CONTINUE TO PLAY OUR KEYROLE IN THE DEVELOPMENT OF AGRICULTURE AND ECONOMY OF PAKISTAN

dh CHEMICALS

DAWOOD HERCULES CHEMICALS LIMITED
MAKERS OF BUBBER SHER UREA

DAWOOD CORPORATION LIMITED
DISTRIBUTERS OF BUBBER SHER UREA

Promoters

معدے کی تیزابیت ، بدہضمی اور بھوک کی کمی کے لیے

لیکوڈ

گیسٹوفل

قرشی

تحقیق کی روایت۔ معیار کی ضمانت

QD – 6

إِنْ شَاءَ اللهُ العَزِیز

ہفت روزہ

ندا

لاہور

کا پہلا شمارہ یکم مارچ کو شائع ہوگا

یکے از مطبوعات

محمدّ حمید احمد پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۲-افغانی روڈ، سمن آباد - لاھور

ہر قسم کے بال بیرنگز کے مراکز

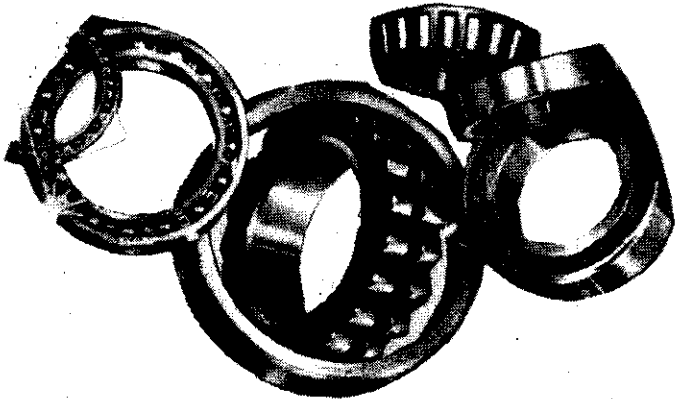

سندھ بیرنگ ایجنسی، ۶۵ منظور اسکوائر پلازہ کوارٹرز کراچی - فون ۷۲۳۳۵۸ / ۷۲۱۱۷۲

خالد ٹریڈرز - بالمقابل کے - ایم - سی ورکشاپ نشتر روڈ کراچی

فون: ۷۳۵۸۸۳ / ۷۳۲۹۵۲ / ۷۳۰۵۹۵

Jawad
Products

We are manufacturing and exporting ready made garments (of all kinds including shirts, trousers, blouses, jackets, uniforms, hospital clothing; kitchen aprons), bedliner, cotton bags, textile piece goods etc.

For further details write to

M/s. Associated industries (Garments) Pakistan (Private) Ltd.,
IV/C/3-A (Commercial Area),
Nazimabad,
Karachi - 18
Tele : 610220/616018 625594

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Regd. L. No. 7360
VOL. 37 No. 2
FEBRUARY 1988